



سنگ کی چیزیں دیکھنے کے لیے

سنگ کی چیزیں

# Korpio Scanned Friendscorner

صاحب  
اس دن بی جی او  
دو دنوں نے کبھی  
ہو گئی تھی

# Scorpio Scanned by Friends.com

مکمل ناول

## ایک پہل موتیے والا

فائزہ افتخار چندا

گیسوائے شام میں ایک ستارہ ایک خیال  
دل میں لئے پھرتے ہیں تمہارا ایک خیال  
بامِ فلک پر سورج چاند ستارے تھے  
ہم نے بیاضِ دل پہ اتارا ایک خیال

فائزہ افتخار کی خلاف معمول ایک ہنستی، مسکراتی، کھلکھلاتی تحریر جو یقیناً آپ کے لبوں پر شگوفے کھلا دے گی۔



# Skorpio Scanned By Friendskorner

”او ہو، بے بے.... آفرآل آئی ایم....“

الفٹ کا بے نہیں جانتی تھی۔ بیٹو تو فیروی تیرے آدھ

برابر ہے بلکہ آدھ سے ایک جماعت اوپر ہی ہے۔“

”مجھے نہیں چاہیے کوئی آدھ برابر۔“ وہ چڑ گیا۔

”تو تجھے کیا اٹھائیں جماعتاں پاس دو، ٹٹی

چاہیے۔“ وہ طیش میں آگئیں ”تاکہ دو بے پڑھے

لکھوں کی طرح تو بھی زنانی کے ”تھلے لگ جائے۔“

انہوں نے مشہور زمانہ طعنہ مارا۔ اس طعنے سے وہ اب

تک اپنے چار بھائیوں کو فیض باب کر چکی تھیں بلکہ اپنی

والدہ محترمہ.... بہشتن کو بھی اسی ”تھلے لگ جانے“

والے طعنے کا تسلی بخش درد کرتے وہ بچپن سے سنتی آرہی

تھیں۔ یہ ان کا خاندانی جدی پشتی طعنہ تھا۔

”پہلے بے بے اپنی ہانڈی کی تو فکر کر۔ میرا خیال

ہے، ساگ ”تھلے لگ“ گیا ہے۔ جلنے کی بو آرہی ہے۔“

”زیادہ“ ناسیں نہ چڑھا۔“ (نتھنے نہ پھلا)۔ ساگ

گوانڈیوں (ہمسایوں) کے گھر پک رہا ہے۔ میری بلا سے

جلے یا سڑے۔“ انہوں نے موضوع سے ہٹنا گوارا نہ کیا

”پہلے تیرا معاملہ صاف کر لوں۔ اب بتا کتنی سو جماعتیں

”بے غیرتا، ماں کو انگریجی میں جھڑکیاں دیتا ہے۔“

”استغفار، استغفار... بے بے میں تجھے جھڑکیاں

دوں گا؟ اپنی ماں کو... یہ کیسے سوچ لیا؟“

”جب بھی تو انگریجی مارتا ہے۔ ایسی ٹٹے منہ شکل

بناتا ہے، کوڑے کوڑے زہر منہ، ناک پھول جاتی ہے اور

آنکھیں سیدھی ماتھے پر چڑھ جاتی ہیں۔ وئے کی طرح

میرے کلچے پر آ کے لگتی ہے تیری انگریجی۔“ بے بے نے

ماتھا پیٹا۔

”او گاڈ.....!“ حمید جنجوعہ عرف میدانے آسمان کی

طرف نگاہ اٹھائی۔ ”میری قابلیت اور ذہانت کی کوئی قدر

ہی نہیں کسی کو۔ میری تعلیم رُل رہی ہے۔ اومائی ڈیئر بے بے

..... میں صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ میں گرتیج....

میرا مطلب ہے کہ چودہ جماعتیں پاس ہوں اور وہ صرف

آٹھویں تک پڑھی ہوئی ہے۔“

”فیر کی ہو یا..... تیرا ابا نو جماعتیں پڑھا تھا اور میں

پڑھی دو، یہی چاہیے ہے۔  
”کم از کم ایف اے تو ہو۔“

”ہاں تو پھر تو بھی کم از کم چار پانچ ہزار تو کماتا ہو۔“

ایک اور طعنہ۔

”بے بے مجھے ہر وقت یہ طعنے نہ دیا کر۔ میں کوئی

بے کار بیٹھا ہوں....؟ صبح سے شام تک.....“

بے بے نے اس کی بات مکمل نہ ہونے دی۔ ”ہاں

ہاں..... صبح سے شام تک سڑکوں پر نخل خوار ہوتا ہے کہ

شاہد رستے میں صدر یا وزیر اعظم مل جائے اور تیرا ہاتھ

پکڑ کر تجھے گورنر کی کرسی تک گھسیٹا لے جائے۔ او کم

عقلا..... کیوں رزق کی ناشکری کرتا ہے۔ کیوں روزگار

کولات مارتا ہے۔ تیرے پیو (باپ) کا کیسا برکت والا

کاروبار ہے۔ جنگ بھی لگی ہو تو لوگ ہانڈی پکانا تو نہیں

چھوڑ سکتے۔ سبزی ترکاری تو ہر حال میں سارے خریدتے

ہیں چاہے منگائی ہو، چاہے ہڑتالیں.... بیماری کی وجہ سے

سے چھ سات دن مہینے میں ”مہمی“ (دکان) بند رہتی ہے

پھر بھی کتنی کمائی ہے۔ اگر تو وہاں بیٹھنا شروع ہو جائے تو

کتنا سکھ ہو۔ تیرا پیو بھی آرام کر لے، تیرا بھی کہیں ٹھکانا

ہو۔ گواچی گاں کی طرح سارے لہور..... میں لور لور کرتا

پھرتا ہے۔“

”بس.... بس..... یہ دو ہی کام تو رہ گئے دنیا میں

میرے کرنے کو، ہے ناں؟ ایک تو ٹنڈے بھنڈی بیچنا

شروع کر دوں اور دوسرا اس بیٹنو چھینو سے شادی کر

لوں۔“

”ہاں..... ایسہ ہوئی ناں گل۔“ بے بے نے فاتحانہ

انداز میں سر ہلایا جیسے اکلوتے سپوت کو اس کی زندگی کے

مقاصد سے روشناس کرنے میں کامیاب ہو گئی ہوں۔

”اب میری بات سمجھا ہے، شباش پتر شباش۔ شادا

میرا بیبا پترا! وہ خوشی سے نہال ہو گئیں۔ حمید ہار مان کر

اٹھ کھڑا ہوا پھر باہر جاتے جاتے رک کر انہیں دوبارہ باور

کرایا۔ اس خیال سے کہ کہیں اپنی غلط فہمی یا خوش فہمی

میں وہ کہیں پورے محلے میں اس کی رضامندی نشر نہ کروا

دیں۔

”بے بے، میں کہہ دیتا ہوں، یہ ناممکنات میں سے

ہے۔“

”کی؟“ وہ ہڑبڑا کر اچھل پڑیں پھر چارپائی کے نیچے

جھانکنے لگیں۔

”کی اے؟ کون اے؟.... جنات میں سے؟“ وہ اب

بوکھلا کر تکیہ اٹھا کے جھاڑنے لگیں۔ حمید نے اپنا ارادہ

ذرا لپیٹ کر ایک طرف رکھا، جہاں پہلے ہی اس کی اودھ

موٹی انگریزی جمائیاں لیتی آنکھیں موند رہی تھیں۔

”اوہو، میں نے کہا، یہ نہیں ہو سکتا۔ کبھی بھی نہیں

ہو سکتا۔ نہ تو میں ابا کی ہٹی پر بیٹھوں گا نہ بیٹنو چھینو سے

شادی کروں گا۔“

”فیر بیٹنو چھینو! کتنی بار کہا ہے صرف بیٹنو تیری

منگ ہے، چھینو تو اس کی وڈی بہن ہے جو تین سال

پہلاں دیا ہی گئی ہے۔ تو بھی جھلا ہی ہے حمید۔ تو

بہنوں سے کیسے شادی ہو سکتی ہے، بڑا سخت گناہ ہوتا

ہے۔ تجھے کسی ماہی شرنے اتنا بھی نہیں بتایا۔ اوئے تیرا دوا،

خالی بیٹنو سے ہونا ہے۔“

”بے بے، خالی بیٹنو سے اور نہ بھری ہوئی بیٹنو سے۔ تو

سمجھ نہیں پا رہا تھا آخر بے بے اس کی بات کو سنجیدگی سے

کیوں نہیں لے رہیں۔

”بس آئندہ میرے سامنے یہ ذکر کرنے کی ضرورت

نہیں۔“

”چل چل.... وڈا آیا اپنی چودھرا ہٹ دکھانے والا

ماں کو انگلی دکھا رہا ہے۔“ وہ بھڑک اٹھیں اس کے تنہی

انداز کو دیکھ کر۔

”وڈا اپنے آپ کو چودھرا جماعتاں پاس کہتا ہے۔ اتنی

تمیز نہیں کہ ماں سے بات کیسے کرنی ہے۔ لال ڈیلے نکال

کر پھوں پھوں کرتا پھر رہا ہے۔ ناں، اتنے سالوں میں تو

نے ایک کتاب بھی ایسی نہیں پڑھی جس میں لکھا ہو کہ

ماں کے پیروں کے نیچے جنت ہوتی ہے؟“

”مجھے بھی پتا ہے کہ ماں کے پیروں تلے جنت ہوتی

ہے۔“ بے بے کا دکھ بھرا انداز دیکھ کر اس کا جارحانہ

طرز عمل ذرا سا کمزور پڑا۔

”لیکن مجھے یہ بھی پتا ہے کہ ماں کے سینے میں ایک

نازک سا نرم سادل ہوتا ہے جو اولاد کی تکلیف پر تڑپ

کریں گے۔

ق  
خ

اور سزا میں

atooni  
specific remedy for  
female diseases



خاتونی

مرض نسائ کی مجرب دوا

120 ml

جانا ہے لیکن..... لیکن بے بے اب کیا ہو گیا ہے تجھے،  
کیوں نہیں اب میری تکلیف تجھے محسوس ہوتی۔ "کمال  
کی ڈراما بازی کی گئی۔ جو سپر ہٹ ہو گئی۔

"ہیں؟..... میرا پتہ..... میرا جن..... تو تکلیف میں  
ہے؟" بے بے گھبرا اٹھیں۔ اس نے ان کی گھبراہٹ  
سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے خراٹے تاثرات میں  
مسکینی اور لاچارگی کا میک اپ کرتے ہوئے مزید  
ڈائلاگ جھاڑے۔

"ماں تو بیٹے کے دل میں بیٹھی ہوتی ہے۔"

"ناں میں اپنی منجی پر ہی بی ہوں۔" انہوں نے نفی

میں سر ہلا کر اس کے جذباتی تجزیے کی تردید کی۔

"ماں تو بیٹے کی ایک تکلیف بر تڑپ اٹھتی ہے۔"

"تو جب سے پیدا ہوا ہے تڑپ ہی تو رہی ہوں۔"

"اس کی ہر خواہش پوری کرنا ماں پر فرض ہوتا

ہے۔" حمید نے بھی ہمت نہ ہاری اور مسلسل پتھر سے اسے

پھوڑتا رہا اور پھر وہی ہو ایسا..... جو اپنے پتھر سے اسے پھوڑنے پر اسے

کا ہوتا ہے..... بے بے نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، قریب رکھا

اپنا بڑا سا لکڑی کا کنگھا اس کے سر پر دے مارا۔

"فرض کتنے یاد کر رہا ہے ماں کو۔ ماں کا حق کیا ہوتا

ہے، یہ میں تجھے یاد کراؤں؟"

"ایسے ہی باؤ نسر مارتی رہی تو رہی سہی یادداشت

بھی چلی جائے گی۔" اس نے سر سہلاتے ہوئے فریاد

کی۔

"چلی جائے۔" بے بے نے سنگ دلی کی انتہا کرتے

ہوئے بے پروائی سے ہاتھ ہلایا۔

"اب رہا ہی کیا ہے تیرے پلے، خون ساڑ ساڑ کے

رنگ تو کاجی جیسا کر ہی لیا ہے۔ اک اک جماعت میں دو

دو تین تین سال لگا کر آنکھوں پر یہ کھوپے بھی چڑھا لیے

ہیں۔ سڑکوں پر جنل خوار ہو کے ماڑا بھی ہوتا جا رہا ہے۔

آنکھ سے شرم، زبان سے لحاظ، دل سے عزت بھی کب کی

مک مکا گئی ہے۔ یادداشت کو چاٹنا ہے، جاتی ہے تو

جائے۔"

"اُف، بے بے، تجھے میرا ذرا خیال نہیں۔" وہ اس

صاف گوئی پر تملتا اٹھا۔ نظر کی یہ عینک اور رنگت کا یوں

پھر چارپائی کے نیچے

ت میں سے؟" وہ اب

حمید نے اپنی اردو کو

پہلے ہی اس کی ادھ

ندر ہی تھی۔

سکتا۔ کبھی بھی نہیں

گا نہ بیسٹو چھینو سے

ہے صرف بیسٹو تیری

ن ہے جو تین سال

ہی ہے میدے۔ دو

بڑا سخت گناہ ہوتا

بتایا۔ اوئے تیراویا

ہوئی بیسٹو سے۔" وہ

کی بات کو سنجیدگی سے

ذکر کرنے کی ضرورت

بھراہٹ دکھانے والا

انہیں اس کے تشبیہ

اس پاس کہتا ہے۔ اتنی

ہے۔ لال ڈیلے نکال

اتنے سالوں میں تو

جس میں لکھا ہو کہ

ہے؟"

پیروں تلے جنت ہوتی

دیکھ کر اس کا جارحانہ

ماں کے سینے میں ایک

ولاد کی تکلیف پر تڑپ

روز بروز اندھیروں کی جانب بڑھتے جانا، ان کی تشویش کا ٹھیک ٹھاک باعث تھے۔

”خیال ہے، میرے جن پتر خیال ہے تبھی تو تجھے اپنے ساتھ پنڈلے جا رہی ہوں۔ اچھی آب و ہوا، صاف ستھرا ماحول اور خالص خوراکن تیری جون بدل ڈالیں گی۔“ مصلحتاً ذرا سی لہجے میں پیدا کی۔

”بائی داوے بے بے.....“ اس نے پُرشوخ انداز میں سر ہلایا۔ ”یہ جو بیٹنو محترمہ ہیں، ان کا شمار خالص خوراکن میں ہوتا ہے یا.....“

”پراں مر.....“ اچھا بھلا اڈا اڈا کر آنے کی کوشش کرتا لاڈاڑن چھو ہو گیا۔

”او جھلنا، چنگلی زبانی بھی ایک نعمت ہوتی ہے۔ شکر کر کہ تیری ماں زیادہ ہے، تیرا اچھا بھلا سوچنے کے لیے، ایسی راج کے سوہنی کرمانوالی دو، سہی تیرے لیے جتنی ہے کہ تو بھی کیا یاد کرے گا۔ بیٹنو جیسی دو سہی تو چراغ لے کر ڈھونڈنے سے بھی ملے گی۔“

”مجھے چراغ کی روشنی میں پسند کی ہوئی دلہن چاہیے بھی نہیں۔“ اس نے باقاعدہ ہاتھ جوڑے۔

”ہونہ، چراغ کی روشنی..... مجھے تو بلب کی روشنی پر بھی بھروسا نہیں، اچھی بھلی گوری چٹی رنگت بلب کی پیلی مدہم روشنی میں پر قان کی ماری ہوئی لگتی ہے اور چراغ..... اس کی ٹٹمٹاتی برائے نام روشنی میں تو آپ نصیبو لال کو بھی میرے سامنے لا کھڑا کریں تو وہ بھی زارا شیخ ہی لگے گی۔“

”ہیں.....“ زارا شیخ کے نام پر ان کے کان کھڑے ہوئے۔

”یہ شیخوں کی لڑکی کو تو کیسے جانتا ہے؟ ان کے گھر تو بڑا سخت پردہ ہے۔“ انہوں نے پچھلی گلی میں رہنے والے شیخ نذر علی کا ذکر کیا۔

”ہا.....“ حمید نے تھک ہار کر ایک گہری سانس بھری اور اٹھ کھڑا ہوا۔ ”ہو رہیل..... امپاسل.....“

”یہ کیا بلے بلے لگا رکھی ہے؟“

”بس بے بے... بس..... خدا کا واسطہ ہے بس.....“

”بس بے بے... بس..... خدا کا واسطہ ہے بس.....“

نہیں۔“ اس کے پسینے جھوٹ گئے۔

”ہاں تو ہمت آئے گی کہاں سے۔ سویرے چائیں، پاپے ڈبوتا ہے، شرڈ شرڈ کر کے کھاتا ہے، فیروں جانے کہاں سے بل گل (برگر) تن کے آتا ہے (مونس کے) اور رات کو سویوں پر سالن ڈال کے کھاتا ہے، بیٹا، کوئی سویوں پر بھی سالن ڈالتا ہے۔“

”او بے بے، کتنی بار بتایا ہے، اسے نوڈلز کہتے ہیں۔“

”کھتے تے سواہ کہتے ہیں (خاک دھول)۔ بے رونقے اور بے برکتے کھانے کھا کھا کر مت ماری گئی ہے۔ اسی لیے کہتی ہوں کہ میرے ساتھ پنڈ.....“

لیکن ان کی بات پوری ہونے سے پہلے تن ان کا لاڈلا میرا ان کی پہنچ سے باہر ہو چکا تھا۔ اس نے بے بے کے ری اشارٹ ہوتے ہی باہر نکلنے میں دیر نہ لگائی۔

میں تمہیں کیا بتاؤں یار، میری مام کتنی ضدی ہیں۔“ حمید جنجوعہ عرف ہومی نے اپنے جگری یار محمود بٹ عرف مومی کے آگے دکھڑا رویا۔ دونوں نے اکٹھے ہی

دیال سنگھ کالج کو پورے سات سال تک رگڑا تھا پھر بی۔ اے کا پل صراط پار کرنے کے بعد حمید جنجوعہ نے توبہ کر لی مگر محمود بٹ نے پنجاب یونیورسٹی کی بھی مٹی پلید کرنے کی قسم کھائی اور اب پچھلے ڈیڑھ سال سے وہ یہاں کے خالص زنانہ وارڈ یعنی سوسالوجی میں خود کو زبردستی

گھسائے ہوئے تھا اور یہ ڈیڑھ سال حمید نے..... یعنی ہومی نے بھی یونہی نہیں ضائع کیے تھے۔ اپنی تھرڈ ڈویژن میں لی گئی بی اے کی ڈگری (جو کہ کئی قسطوں میں حاصل کی گئی تھی) ہاتھ میں لے کر بڑی بڑی کمپنیوں، فیکٹریوں اور دفاتروں کے چکر لگائے تھے کہ شاید کہیں چیف

ایگزیکٹو، جنرل منیجر یا پھر ڈائریکٹر جنرل کی پوسٹ خالی ہو اور وہ اس پر رونق افروز ہو کر ملک و قوم کی خدمت کر سکیں..... مگر شومی قسمت کہ کسی نے اس کے ٹیلنٹ اور ذہانت کی قدر نہ کی اور اپنی ہر ناقدری کارونارونے کے لیے اس کے پاس ایک ہی بندہ تھا۔ مومی۔

میں تمہیں کیا بتاؤں یار، میری مام کتنی ضدی ہیں۔“ حمید جنجوعہ عرف ہومی نے اپنے جگری یار محمود بٹ عرف مومی کے آگے دکھڑا رویا۔ دونوں نے اکٹھے ہی

دیال سنگھ کالج کو پورے سات سال تک رگڑا تھا پھر بی۔ اے کا پل صراط پار کرنے کے بعد حمید جنجوعہ نے توبہ کر لی مگر محمود بٹ نے پنجاب یونیورسٹی کی بھی مٹی پلید کرنے کی قسم کھائی اور اب پچھلے ڈیڑھ سال سے وہ یہاں کے خالص زنانہ وارڈ یعنی سوسالوجی میں خود کو زبردستی

گھسائے ہوئے تھا اور یہ ڈیڑھ سال حمید نے..... یعنی ہومی نے بھی یونہی نہیں ضائع کیے تھے۔ اپنی تھرڈ ڈویژن میں لی گئی بی اے کی ڈگری (جو کہ کئی قسطوں میں حاصل کی گئی تھی) ہاتھ میں لے کر بڑی بڑی کمپنیوں، فیکٹریوں اور دفاتروں کے چکر لگائے تھے کہ شاید کہیں چیف

ایگزیکٹو، جنرل منیجر یا پھر ڈائریکٹر جنرل کی پوسٹ خالی ہو اور وہ اس پر رونق افروز ہو کر ملک و قوم کی خدمت کر سکیں..... مگر شومی قسمت کہ کسی نے اس کے ٹیلنٹ اور ذہانت کی قدر نہ کی اور اپنی ہر ناقدری کارونارونے کے لیے اس کے پاس ایک ہی بندہ تھا۔ مومی۔

مصر  
داڑھیوں  
سورہیل سے خوراک

ECONOMY  
PACK  
18

پٹی  
اینٹل

Please register!

دینے والوں میں شامل ہو گئے تھے۔ جب سے اس نے بی۔ اے کے امتحان میں ”بالآخر“ سرخروئی حاصل کی تھی۔ بے بے کورہ رہ کر اپنا ”پیکا پنڈ“ (میکے کا گاؤں) یاد آ رہا تھا۔ میکے کی یاد کے ساتھ ہی بچپن کی سنگی سہیلیوں کی یاد بھی ستانے لگی اور ایسے ہی ایک روز اپنے بیچا زاد بہن، دوپٹا بدل بہنیں اور ”گوڑھی سہیلی“ تاجاں کا ذکر آتے ہی وہ پھڑک پھڑک گئیں۔

”بیرا غرق میری عقل کا، کیسی بھلکڑھوں میں بھی۔“ انہوں نے سامنے بیٹھے میدے کو دو ہتھ مارا۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھا۔

”اوہو، بے بے..... جب کوئی بھولی بسری بات اچانک یاد آئے تو اپنے ماتھے پر زور کا ہاتھ مارا جاتا ہے نہ کہ ساتھ بیٹھے بے قصور کو تپتڑ تپتڑ پٹا جاتا ہے۔“

”اوہو..... پر میری عقل سدھ بدھ تو تم باپ بیٹے نے مار رکھی ہے نا۔“

”تو پھر مجھے صرف میرے حصے کا ماریں۔ ابا کا سنبھال کر رکھیں، آنے ہی والا ہو گا۔“

”لغتیا، میں کیا اپنے سر کے سامنے پر ہاتھ اٹھاؤں گی۔“

”تو کیا حرج کیا ہے اور کوئی کسر کب چھوڑی ہے۔“ اس نے آہستہ سے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔

”چھ سال پہلے جب میں پنڈ گئی تھی، تاجاں کی وڈی دھی کی ”کڑمائی“ (مگنی) پر..... تو تب بھی اس نے دبے لفظوں میں ذکر کیا تھا۔ میں تسلی دے آئی تھی کہ بس تو میری امانت سنبھال کے رکھیو، وقت آنے پر میں خود ہی لینے آ جاؤں گی اور دیکھو ذرا..... چھ سال ہو گئے ہیں، میں نے پلٹ کر پیچھے نہیں دیکھا ہورے وہ کیا سوچتی ہوگی۔“

”یس..... آپ کا خیال ہے وہ اب تک سوچ میں پڑی ہوں گی آپ کی امانت لے کر۔“

مذاق اور طنز میں حمید کبھی شائستگی کا دامن نہیں چھوڑتا تھا بلکہ اگر چھوڑا ہوتا تو بھاگ کر تھام لیا کرتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ بے بے کی کسی بات کو پکڑ کر مذاق اڑاتے وقت اس کا طرزِ تمخاطب خاصا بر خوردارانہ اور تمیزدارانہ ہو جاتا تھا۔ اب بھی اس نے آپ جناب کے تڑکے کے

ساتھ سحر اڑایا۔ ”او میری بھولی بے بے، ان کے پاس تو کوئی فرنیج بھی نہیں جہاں وہ آپ کی امانتیں فریز کر دیتیں۔ کھاپی کے ڈکار گئی ہوں گی اب تک اور اچھا بھی کیا، چھ سالوں میں تو اب کیڑا پڑ گیا ہو گا۔“

”ہاے ہائے خیری صلا..... کیڑے کیوں پڑنے لگے، جیتی جان کو۔ اللہ سے خیراں رکھے۔ آخر اسی نے میرا ویٹرا آباد کرنا ہے اور یہ کیا بکواس کر رہا ہے کہ تاجاں کھاپی گئی ہوگی۔ میرے پورے ممبر برادری میں کوئی ڈائن نہیں۔ تیرے ”دادکوں“ (دھیال) میں ہوتی ہوں گی ایسی بچے کھانیاں۔“

”جیتی جان؟..... ڈائن.....؟ بچے کھانی..... سوری بے بے میں تو سمجھا، تو نے حسب معمول کوئی پیجیری، کوئی لڈو، کوئی بڑیاں، کوئی گھی وغیرہ بطور امانت رکھوایا ہو گا۔ مجھے کیا پتا کہ گھر بار سنبھالنے کے لیے کسی نوکرانی کا بندوبست کروا کے آئی ہوگی۔“

”ہاں ہاں، بڑا مربعوں پر پھیلا حویلا ہے نا تیرا، دو درجن جی کا مبر ہے جس کی روٹیاں تھپنے کے لیے میں پنڈ سے نوکرانی لے کر آؤں گی۔ اپنے رہنے کی تھاں ہے نہیں، نوکرانی لا کے کیا سر پر بٹھانی ہے۔ میں تو بیسنوکی بات کر رہی ہوں، اس کی نکلی دھی کی۔ وہ میری امانت ہے اور اسے لانے کا اب ویلا (وقت) آ گیا ہے۔“

”اور اسے لا کر کہاں رکھنا ہے، سر پر؟ ابھی خود ہی تو کہہ رہی تھیں کہ اپنے رہنے کی جگہ نہیں۔“

”تیرا ابا کہہ رہا تھا کہ اوپر کوٹھے پر برساتی گرا کر وڈا کرا اور غسل خانہ بنائے گا۔ تسی دونوں خیر سے اذپر چلے جانا۔“

”تسی دونوں؟“ وہ بوکھلا کر بے بے کو دیکھنے لگا جو اب اطمینان سے دھاگے سے خلال کرنے میں مصروف تھی۔

”کون دونوں؟“

”تو اور پیمنو۔“

”لا حول ولا.....“ وہ بدک کے اٹھا۔

”بے بے ہوش میں تو ہو، یا بالکل ہی..... کہیں ابا

دے رہا تھا۔ اس وقت بھی گھٹنا دو گھٹنا بے بے کے ساتھ مغز ماری کے بعد وہ اب پنجاب یونیورسٹی کے کیفے ٹیریا میں مومی کے سامنے بیٹھا جلے دل کے پھپھولے پھوڑ رہا تھا۔

”اب تم ہی بتاؤ، کیا میں کسی ایسی لڑکی سے شادی کر سکتا ہوں جسے میں نے نہ تو دیکھ رکھا ہو نہ سن رکھا ہو۔“

”بات تو تم نے آٹھ آنے صحیح کی ہے۔“ مومی نے سر ہلایا۔

”آٹھ کیوں؟ سولہ آنے کیوں نہیں؟“

”میں چھوٹے لوگوں کی طرح آنے آنے کا حساب نہیں رکھتا۔“ شان بے نیازی سے فرمایا گیا۔ ”دیے آپس کی بات ہے تم نے بتایا نہیں کہ تم لوگ پیچھے سے پینڈو ہو۔“ اس کے زازداری سے کہنے پر مومی نے ایک دم چونک کر پیچھے مڑ کر دیکھا۔

”پیچھے سے؟..... اوہ ہاں..... ہاں ہاں..... زمیندار لوگ ہیں ہم..... کہاں ہے تمہیں نہیں بتایا میں نے..... ہاں نہیں بتایا ہو گا۔ میری عادت جو نہیں فضول میں سیخیاں بگھارنے کی۔“

”لیکن تم تو بتا رہے تھے تمہارے ڈیڈی کا بزنس ہے۔“

”ہاں وہ ذرا بزنس مائنڈ ڈتھے۔ اس لیے زمینداری اور جاگیروں سے ذرا دور دور ہی رہے۔“ (حالانکہ زمینیں اور جاگیریں خود اس کے باپ تو کیا دادا تک سے دور دور ہی رہیں۔)

”عرصہ پہلے گاؤں چھوڑ کے لاہور آئے تو پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔“ وہ اصل قصہ پی گیا جو بے بے اکثر چٹخارے لے لے کر سنایا کرتیں کہ کس طرح ابا نے پنواریوں کی لڑکی کو چھیڑا اور جواب میں پنواریوں نے مار مار کے ابا کا بھر کس بنا دیا اور پنچائیت نے فیصلہ سنا دیا کہ یہ لڑکا گاؤں میں قدم نہیں رکھ سکتا۔

”پھر یہاں بزنس اتنا پھیل گیا کہ انہیں جانے کی فرصت بھی نہیں مل سکی۔“ واقعی بزنس تو ترقی ہی کر رہا تھا۔ کہاں سر پر ٹوکرا رکھ کے گلی گلی ”آلو اے“ بھنڈی اے، توری اے..... بڑی تازہ اے..... اے..... کی

کا اسپیشل حقہ تو نہیں پی لیا۔ بھلا میں اور وہ چیکو... یا کیا نام ہے..... ہاں بیٹنڈو..... ہم دونوں ایک کمرے میں کس طرح..... کیا کوڑے لگوانے ہیں مجھے؟ یہ اسلامی جمہوریہ ہے میری ماں..... تمہیں یہ امر کا والی ہوا کہاں سے لگ گئی؟“

”ہوا تو تو اپنی کھوپڑی کو لگوا، یہ ڈھکن اتارناں ذرا۔“ بے بے نے چڑ کر اس کی کس کے پنی ہوئی کیپ اتاری۔

”جھلیا، وہ تیری منگ ہے، تیرے بچپن کی منگ۔ میں تیرے ویاہ کی بات کر رہی ہوں۔“

”اچھا اچھا.....“ وہ معاملے کی تہ تک پہنچ کر ہلکا ہلکا ہو گیا ورنہ بے بے کی ابھی ہوئی بات نے تو اس کے ہاتھوں سے بطوطے، کبوتر، کوئے، چڑیاں سب کچھ اڑا دیا تھا۔

”اوہو..... تو یہ بات ہے، میں سمجھا کہ..... اچھا

اچھا..... ہیں..... کیا؟..... کیا کہا؟“ اطمینان سے سر ہلاتے ہلاتے وہ خود بھی ہل کر رہ گیا۔ ”کیا کہا؟ کیا یعنی منگیترو..... یعنی فیانی۔“

”ہائے ہائے، پھانسی چڑھیں تیرے دشمن۔“

”اپنے ہاتھوں میرے گلے میں پھندا پھنسا کے مرنے کی نوید دشمنوں کو سنار ہی ہو بے بے۔“ وہ بلبلایا ہی تو اٹھا۔

اور اس کے بعد بے بے نے اس ذکر کو حمید عرف مدے عرف ہومی کی چھیڑنا ڈالا۔ اٹھتے بیٹھتے، سوتے اونگھتے، چلتے پھرتے..... ہر وقت بیٹنڈو کو ”سوہا جوڑا“

پہنانے کی آرزو کا اظہار کیا جاتا۔ وہ جس حد تک جارحانہ طرز عمل اپنا سکتا تھا، اپنا چکا تھا، جتنا تلخ ہو سکتا تھا، ہو چکا تھا مگر وہ بے بے تھی..... حمید جنوعہ کی بھی بے بے..... کیسے آسانی سے بلیک میلنگ کا شکار ہو جاتی۔ اب تو کچھ

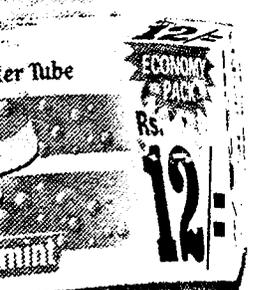
دلوں سے انہوں نے یہ شوشہ چھوڑ رکھا تھا، پہلے خود جا کر بات کی کرنے کا ارادہ ظاہر کرتی تھیں اب اسے بھی ساتھ گھسیٹ لے جانے کا فیصلہ سنا دیا۔ شاید ان کا خیال ہو کہ آنسو بیٹنڈو کے حسن ہو شرابا سے گھائل ہو کر میدا خود ہی سرا باندھ لے لیکن میدا تھا کہ پٹھے پر ہاتھ نہ رکھنے

ان کے پاس تو کوئی... انانتی فرزند کر دیتیں... اور اچھا بھی کیا... کیڑے کیوں پڑیں... آخر اسی... کیوں اس کر رہا ہے کہ... کے ٹیڑا دردی میں کوئی... (ھیال) میں ہوتی ہوتی...؟ بچے کھانی... معمول کوئی پیجری... اور امانت رکھوایا ہو... کے لیے کسی نوکرانی... یا حویلا ہے ناں تیرا... تھپنے کے لیے میں... پتے رہنے کی تھاں... ہے۔ میں تو بیٹنڈو... وہ میری امانت... لیا ہے۔“

سر پر؟ ابھی خود ہی... نہیں۔“

پر برساتی گرا کر... دل خیر سے اوپر... بے کو دیکھنے لگا... نے میں مصروف... کہیں۔

ایسی لہجہ بنی



”ہاں تو جگر..... کیا کہہ رہے ہو تم.... کونسا گاؤں ہے جہاں کی الہزنیار کو آئی نے تمہارے لیے جن یا ہے۔“

”یار ان کی کزن کی بیٹی ہے، بی..... پکی..... اور وہ کچھ عجیب سا نام ہے گاؤں کا.... سا نگلاہل۔“

”تم نے دیکھا ہے؟“

”ہاں بہت پہلے..... وہی ٹیپیکل حالت، ہر طرف بھنبھناتی کھیاں، سخت بدبو۔“

”نہاتی نہیں ہوگی۔“

”ہیں.....! کون؟..... میں گاؤں کی بات کر رہا ہوں۔“

”اور میں پکی کی۔“

”کون پکی..... اچھا اچھا بی..... پکی..... اسے تو میں نے نہیں دیکھا یا شاید تمہی دیکھا ہو گا مگر مجھے یار نہیں۔“

”ہوں.....! تو گویا معاملہ الجھا ہوا ہے۔ میری مانو تو تم آئی کے ساتھ ایک بار جا کر دیکھو تو سہی کیا پتا تمہیں پسند آجائے۔“

”نہ..... نیور..... اس امپاسبل، بھلا وہ میرے معیار پر کیسے اتر سکتی ہے۔ آفٹر آل آفم گریجویٹ۔“

”اسے دیکھے بغیر مفروضے کیوں گھر رہے ہو۔ ایسا کرتا ہوں میں بھی تمہارے ساتھ ہی چلے چلتا ہوں، تمہاری مورل سپورٹ ہو جائے گی۔“

”ہاں، یہ ٹھیک ہے..... لہ..... لیکن..... تم کیسے..... اوہو..... نہیں نہیں..... یہ کیسے ہو سکتا ہے۔“

وہ ہامی بھرتے بھرتے اچانک گھبرا گیا۔ ”مام“ اور ”ڈیڈ“ کا بھانڈا پھوٹ سکتا تھا۔

صدائیں لگا کرتی تھیں، پھر چند سال بعد یہ نوکرا ریڑھی میں تبدیل ہو گیا۔ دن کو سبزی بیچ دینے کے بعد دوپہر کے بعد اسکولوں، کالجوں کے سامنے اسی ریڑھی پر مسالے والی گاجر مولی سردیوں میں اور برف پر لگا تریوز گرمیوں میں بیچا جاتا اور اب ماشا اللہ اپنی دکان چھی، بسم اللہ پھل اور سبزی فروش کے نام سے۔

”زبردست..... ایمان سے.... تباہی ہے تباہی۔“

مومی کے چسکے لینے والے انداز پر ہومی ذرا سا ٹھٹھا کا اور پیچھے مڑ کے دیکھا۔ تین لڑکیاں ہنستی کھلکھلاتی اسی طرف چلی آ رہی تھیں اور مومی کی نگاہیں درمیان والی طرف فوکس تھیں جس نے رنگ اڑی جینز کے نیچے پٹاوری چپلیں پہن رکھی تھیں اور جینز پر کھدر کا کالا کرتہ تھا جس پر ملے نیلے رنگ کے دھاگے تھے عجیب جلیبی نما کڑھائی ہوئی تھی، سر پر کالی جالی کا اسکارف باندھ رکھا تھا۔

”یہ کیا چیز ہے؟ آدھا تیر، آدھ بیئر۔“ اس نے بصرہ کیا جس کی فوری تصحیح مومی نے کی۔

”یوں کہو کہ آدھی کبوتری اور آدھی مورنی۔“

”تم اس آدھی ادھوری کو ٹکٹکی باندھے کیوں گھور رہے ہو؟“

”دل آگیا ہے تمہارے یار کا۔“

”کیا.....!“ اس پر بھی؟ پھر یار مجھے تو اجازت دو پھر ملاقات ہوگی۔“ اس نے کھسک لینے میں عافیت جانی۔

کیونکہ اس سے پہلے بھی جس جس پر.... مومی کا دل آیا تھا، اس کی جوتی ہی مومی کی جانب آئی تھی اور اس مشرق و مغرب کے امتزاج نے تو چار سداہ برانڈ کی موٹے سول والی چپل پہن رکھی تھی۔

”ارے یار، بیٹھو تو سہی، ابھی تمہارے مسئلے کا حل بھی نکالنا ہے۔“

”ہیلو چا چا جی۔“ تینوں لڑکیوں نے ان کی ٹیبل کے نزدیک آتے ہی گرمجوشی سے کورس میں کہا۔ مومی کے چہرے پر ایک رنگ آ رہا تھا تو ایک جا رہا تھا جبکہ ہومی مزے لیتا ہوا یہ سارے رنگ گن رہا تھا۔

”مذاق کی عادت ہے....“ ان کے آگے جانے پر اس نے کھسیا کر بات ٹالی۔

بہتر کو الٹی

بانا ممکن!

خود یقین

”میری مام بالکل پسند نہیں کریں گی۔“

”آئی کو میں سمجھا لوں گا۔“

”وہاں سخت گرمی ہوگی۔ اے۔ سی بھی نہیں ہوگا۔“

رات کو پچھر کاٹیں گے۔“

”چلو، یہ ایڈو پنجر بھی سی۔“

”اتنا ہی ایڈو پنجر کا شوق ہے تو اس آدھی کبوتری

آدھی مورنی کو چھیڑنے دیکھ لو، سارے ارمان پورے ہو

جائیں گے۔ چار دن حوالات میں رہنے کے بعد بھی

تبدیلی آج وہاں ہو سکتی ہے۔“

”بہت بے مروت ہو تم.... میں نے سوچا، یار کے

ہمانے ہم بھی گاؤں دیکھ لیں کہ کیسا ہو سکتا ہے۔ میں نے

تو صرف کتابوں میں پڑھا ہے یا فلموں میں دیکھا ہے۔ وہ

ہری بھری پگڈنڈیاں، وہ پگھٹ، وہ آم کے باغ.... اوه

..... سورمانٹک۔“

”فلمی گاؤں اور اصلی گاؤں میں بہت فرق ہوتا

ہے۔ وہاں کوئی صائمہ فل میک اپ میں کنوئیں سے پانی

بھرنے نہیں جاتی، نہ ہی کوئی نرگس۔ آم کے باغ میں سفید

ملل کے کڑتے میں بارش میں نہاتی پھرتی ہے۔ اب

میری جان چھوڑو.... مجھے شاپنگ کے لیے جانا ہے۔“

”چلو میں بھی چلتا ہوں، کہاں جانا ہے؟“

”بیٹوراما.... یا پھر وہاں کچھ پسند نہ آیا تو پوٹ

پوری۔“

”ہاں میں چلتا ہوں، مجھے بھی شاپنگ کرنی ہے۔“

پوٹ پوری والے مجھے اچھی طرح جانتے ہیں، مہینے میں

دو بار وہاں جاتا ہوں، اس لیے۔ بڑی واقفیت ہے

میری۔“

”اچھا پھر تو ضرور چلو۔ مجھے ڈسکاؤنٹ کروا دینا یا پھر

اپنے کریڈٹ کارڈ پر کچھ دلوا دینا۔ میں پرسوں پاکٹ منی

ملتے ہی تمہیں لوٹا دوں گا۔“

”ہاں.... ہاں.... لگ.... کیوں نہیں.....“

ض.... ضرور.... لیکن مجھے یاد آیا، آج میری مام نے

میری بڑی سسٹر کے گھر جانا تھا، وہ لوگ کل ورلڈ ٹور پر جا

رہے ہیں، ان سے ملنے گئی ہیں۔ مجھے تو اپنے، پاپا اور

چھوٹے بہن بھائیوں کے لیے لیچ کے۔ ایف۔ سی سے

پیک کروا کے لے جانا ہے۔ وہ میرے انتظار میں ہوں

گے۔ اچھو نیلی ہمارا شیفت بھی چھٹی پر ہے۔“ اس نے

معذرت کی تو ہومی نے سکون کا سانس بھرا۔ اس کی

بروقت ”امداد طلب“ پالیسی نے کام کر دکھایا اور چیونٹ

کی طرح چپکا محمود بٹ از خود کھینچے ہوئے الاسٹک کی طر

دور ہو گیا۔

چند منٹ بعد ایک دوسرے کو بائے بائے کرنے کے

بعد اب حمید جنجوعہ قریب سے گزرتے ”جنگ جی“

پر سوار ہو گیا جو پہلے ہی چھ سواریوں سے لدا ہوا تھا۔ اس

کی منزل ریلوے اسٹیشن کے قریب والا ”لنڈا بازار“ تھا

جب کہ محمود بٹ صاحب لکشمی کے نان پکوڑے اور

”چکڑ چھولے“ پیک کروا رہے تھے۔ ریڑھی والے کی

منتیں کرتے ہوئے۔

”پانی، تھوڑے پھولے، تھپے کے ساتھ لگے رہ گئے،

ذرا کھینچ کے چچ لٹافے میں چھڑکو۔“

”دیکھ امیدے وہ پنڈ ہے اور وہ بھی میرا

”پیک پنڈ“.... تیرا ”نانکا پنڈ“ (ننھیالی گاؤں)۔ وہاں

میری ناک نہ کٹوا دینا۔ ذرا طریقے سلیقے کے کپڑے رکھ

بکے میں۔ یہ موٹی رنگ برنگے پھولوں والی آدھی پتلونیں

اور یہ ماس سے چھٹی بغیر بازوؤں کی بنیائیں کیوں رکھ رہا

ہے۔“

”یہ بنیائیں نہیں، اسکن ٹائٹ شرٹس ہیں اور یہ

آدھی پتلونیں نہیں، برموداز ہیں۔ اس قدر گرمی میں

وہاں تھری پیس سوٹ تولے جانے سے رہا۔“

”وہ کڑیوں والا گھر ہے بے غیرتا، ادھر تو ننگا پنڈا

نیکریں پن کے بے شرمی سے پھرتا رہتا ہے۔ وہاں یہ

سب نہیں چلے گا۔ تیرے مامے نے دیکھ لیا تو سو سو چھتر

لگائے گا۔“

”اچھا ٹھیک ہے، گھر کے اندر نہیں پنوں گا۔“ وہ

”چھتروں“ والی دھمکی سے ڈر گیا۔ مامے رشید کا ہاتھ تو

یوں بھی بھاری تھا، وہ آؤٹ چھتر بھی اوسان خطا ہو جاتے

تھے، وہ چھتر تو نہ جانے کیا حال ہو۔

”باہر بھی نہ پن کے نکلنا۔ سارے پنڈ کے کتے

وہ میرے انتظار میں ہے۔  
 بھی چھٹی پر ہے۔ اس  
 کا سانس بھرا۔ اس  
 نے کام کر دکھایا اور  
 صبح ہوئے اسٹیک کی طرف  
 کے کوبائے بائے کرنے  
 سے گزرتے ”چنگ پین“  
 یوں سے لدا ہوا تھا۔ اس  
 ریب والا ”لنڈا بازار“ تو  
 ہی کے نان بکوڑے اور  
 تھے۔ ریڑھی والے کی  
 بچے کے ساتھ لگے رہ گئے۔  
 ہے اور وہ بھی میرا  
 نھیالی گاؤں۔ وہاں  
 تھے سیتھے کے کپڑے رکھ  
 لوں والی آدھی چلوں  
 بنیائیں کیوں رکھ رہ  
 ٹ شرتس ہیں اور یہ  
 اس قدر گرمی میں  
 سے رہا۔“  
 غیرتا، ادھر تو ننگا پنا  
 تا رہتا ہے۔ وہاں  
 نے دیکھ لیا تو سو سوچنے  
 نہیں پہنوں گا۔“  
 مامے رشید کا ہاتھ  
 اوسان خطا ہو جانے  
 مارے پنڈ کے

بچے بڑ جائیں گے۔ تیرے لیے دو ملل کے کڑتوں  
 رکڑھائی کردائی ہے، سات لکھے کی شلوار اور یہ ایک  
 نلکے نلے رنگ کا شلوار قمیص..... بڑا اچھا سوتی کپڑا ہے۔  
 شہزادہ لگے گا میرا پتر اور یہ ڈھکن نہ سر پر رکھنا، پچھلے سال  
 پھوپھی کی ساس ج سے واپس پر جو ٹوپی دے گئی تھی میں  
 وہ نکال دیتی ہوں۔“

”خدا کے واسطے بے بے..... وہ بنگالی ٹوپی نہ دینا  
 مجھے..... میں ننگے سر ہی ٹھک ہوں، چاہے تپتی دھوپ  
 میرا بھیجا ہی کیوں نہ روٹ کر دے۔“ اس نے پیکنگ  
 مکمل کر لی۔ اپنا داک مین، برسنی سپئیر اور جینفر لوپاز  
 کے ولیم، کاسمو پولیشن کا پرانا شمارہ (جو رڈی والے سے  
 لی۔ اے کے کورس کے عوض حاصل کیا تھا) اور چیونگم کا

پیک رکھنا وہ نہ بھولا۔

”میدے پتر، باہر تیرا کوئی پارہ لے آیا ہے۔“  
 بے بی نے آواز پر وہ چونک گیا۔ اس کا کوئی پارہ اب تک گھر  
 نہیں پہنچے پایا تھا (اس کی حفاظتی تدابیر کی بدولت).....  
 پھر یہ کون ہے..... کیس موی..... اداہ نو..... وہ ادھر ادھر  
 چھنے کی جگہ تلاش کرنے لگا کہ موی اندر تک گھسا چلا  
 آیا۔

”ارے آئی، ہوی نے بتایا نہیں کہ میں بھی آپ  
 کے ساتھ گاؤں جا رہا ہوں، اس کے بے حد اور پُر زور  
 اصرار پر۔“

”لے..... کب بتایا..... ہے ہی میسنا“

”آئی، آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں؟“ اس نے  
 کن انھیوں سے حمید کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا جو  
 دانت کچکچاتے ہوئے اسے گھور رہا تھا۔

”نہ پتر، مجھے کیوں اعتراض ہو گا۔ جم جم آؤ سو بسم  
 اللہ تیرا اپنا پنڈ ہے۔ بس ذرا میدے کا پیو آجائے، مٹی  
 سے۔ چایاں اسے دے کراڑے چلتے ہیں۔“

”میدے کا پیو.....“ اس نے بہ آواز بلند دہرایا  
 ساتھ ہی ایک تڑپانے کلسانے والی ذلیل سی مسکراہٹ  
 سے اسے نوازا جو نخل ہو کر پھر سے پیک شدہ سامان کی  
 تلاشی لینے میں مگن تھا۔

”بائی داوے آئی..... انکل کی ”مٹی“ کس چیز کی

ہے، کریانے کی؟“

”نہ پتر..... سبزی پھل کی ہے۔ پوری پکی ٹھسھی  
 میں، سب سے تازہ سبزی تیرے چاہے کی ہوتی ہے۔ آخر  
 کیوں نہ ہو، سرگی ویلے (سحری کے وقت) کھوتا ریڑھی  
 لے کر منڈی جاتا ہے اور جن جن کر آلو، کریلے، نماثر اور  
 مولیاں لاتا ہے۔ تو نے بتایا نہیں پتر کہ تیرا پیو کیا  
 کرتا ہے؟“

”وہ سائیکارٹسٹ ہیں آئی۔“ اس نے جتانے والی  
 نظروں سے حمید کو دیکھا۔

”سینکل ٹائر..... سینکلوں کے ٹائروں کے پتھر لگاتا  
 ہے؟“ انہوں نے ناک پر انگلی رکھ کے پوچھا۔

”نہیں آئی، سائیکارٹسٹ..... یعنی نفسیاتی ڈاکٹر۔“

یوں سمجھ لیں کہ جیسے کوئی بیمار ہوتا ہے تو عام ڈاکٹر کے

پاس جاتا ہے اسی طرح جب کوئی پریشان ہو، غمگین ہو تو  
 نفسیاتی ڈاکٹر کے پاس جاتا ہے۔ میرے پاپا لوگوں کے غم،  
 دکھ، درد، پریشانی اور ٹھکن کا علاج کرتے ہیں۔ جو ان کے  
 پاس آتا ہے، ہلکا پھلکا اور پُر سکون ہو کر واپس جاتا ہے۔  
 اور میری مام سوشل ورکر ہیں یعنی لوگوں کے کام آتی  
 ہیں۔ ان کی مدد کرتی ہیں۔ ان کے مسئلے حل کرتی ہیں۔“

”اچھا اچھا، کونسلر ہوں گی..... شادا ابھی ٹور ہیں  
 تیرے ماں پیو کی۔“ بے بے متاثر ہو گئیں اور ساتھ ہی  
 چہرے کے آگے اخبار پھیلا کے بیٹھے میدے کو لتاڑا۔

”ہائے ہائے شرم دا گھانا..... گھر پر وہنا (مہمان)  
 آیا ہے، تو اخباریں چاٹ رہا ہے۔ جا شاپش..... چھیتی  
 سے کما نوالے کی، مٹی سے ڈکار والی بوتل لے کر آ۔ پتر  
 کالی پیے گا یا ہری۔“

”جی فاشا..... آئی مین اورنج... یعنی پیلی۔“

”اچھا اچھا کھٹی..... ہاں اس کا بھی واواہ سواد  
 ہے۔ جا پتر یہ لے نور پے.....“ بے بے نے چادر کا پلو  
 کھول کر پانچ کانوٹ اور دو سکے تھمائے۔

”کھول کے نہ لانا، بندھی لانا نہیں تو ساری گیس  
 مک جائے گی۔ بغیر گیس کے بوتل پیو تو راج کے ڈکار بھی  
 نہیں آتے۔“



بے بے کا پروگرام تو لاری اڈے پر جا کر بس پکڑنے کا تھا مگر مومی کی تجویز پر وہ ٹرین میں جانے کو تیار ہو گئیں۔ ہوی البتہ سارے رستے چپ ہی رہا۔ محمودیٹ کے اچانک چھاپے نے اس کی ہوائیاں اڑا رکھی تھیں۔ اگرچہ فطرتاً وہ خاصا..... بلکہ قابل رشک حد تک ڈھیٹ اور بے غیرت سا شخص تھا لیکن آج نہ جانے کیوں شرمندگی کنڑوں میں نہیں آ رہی تھی۔ وہ خود بھی شرمندہ ہوتے ہوتے تھک گیا تھا جبکہ مومی اسے شرمندگی کے جوڑ میں مسلسل غوطے دیتا نہیں تھک رہا تھا۔ اس کی بے بے کے ساتھ طویل گفتگو اسے تملائے دے رہی تھی۔

”لو جی، آگیا ساڈا سوہنا سانگلا بل۔“ لاہور سے فیصل آباد جانے والی تیز کام سیرانگلا بل کے اجاڑ ویران اور مختصرے پلیٹ فارم پر ڈون کے پونے تین بجے رکی۔ جولائی کی گرم ترین دوپہر تھی۔

”دیکھا، یہاں کاسکون اور صفائی ہے“ جب بے نے داد طلب نظروں سے دیکھا۔ ”وہاں لاہور کا اسٹیشن کتنا گندا اور غلیظ تھا۔ ہر طرف رش..... پان کی پیک، بدو..... اور ادھر.....“

”نہ بندہ نہ بندے کی ذات۔“ حمید نے بات کاٹ کر لب کشائی کی۔

”کوئی بھولا بھلا ادھر آئے گا تو گند ڈالے گا۔“

”آئی، یہاں سے رکشالے گا یا ٹیکسی۔“

”لو کر لو گل..... اوئے جھلے، ادھر تانگے چلتے ہیں۔“

لیکن پندرہ منٹ تک وہاں کھڑے رہنے کے بعد کوئی تانگہ نہ ملا۔ ایک سڑے مزاج والے قلی سے پتا پوچھ کر وہ تانگہ اسٹینڈ کی طرف خود ہی چل پڑے۔ جہاں اس قلی سے بھی زیادہ سڑے مزاجوں والے کوچوان سے واسطہ پڑا۔ تانگہ اسٹینڈ کیا تھا ایک تندور مارکہ ہوٹل تھا جس کے کچے احاطے کے ایک طرف تانگے کھڑے تھے تو دوسری جانب درختوں کی چھاؤں میں چارپائیاں ڈالے کوچوان حضرات قیلولہ فرما رہے تھے۔ کوئی ایک بھی انہیں لے جانے پر تیار نہ ہوا۔

”اومالی، یہ ہمارا ویلا ٹیم ہے (فارغ وقت)۔ اتنی

شکر دوپہر میں تمہارے چہ روپے کے لیے ہم اپنے چہ روپے (جسم) کو لو کیوں لگوائیں۔“ نکا سا جواب ملنے پر سب نے بھی جی بھر کے نکلے نکلے کی سنائیں۔

”اللہ کرے تیرے پورے نمبر کو لو گئے..... تیرے گھوڑے کو ”کھرک“ (خارش) پڑ جائے۔ اللہ کی ماز شہریوں سے بڑھ کے بے دید ہو گئے ہیں، روئے آرام کرنے کو۔“ اس سے پہلے کہ بے بے ان کی ماں بہن ایک کرنے پر اتر آئیں۔ حمید اور محمود انہیں کھینچ کر ایک طرف لے گئے۔

قریب سے گزرتے ایک ٹریکٹر ٹرالے والے نے انہیں ”لفٹ“ دی۔ بے بے تو ”ٹھکے“ کے ساتھ آگے بیٹھیں۔ وہ دونوں بھیمنوں کو ڈالنے والے ”پنوں“ کے آرام دہ بستر پر بیٹھے بیٹھے گئے۔

”واؤ..... انس آر سیل ایڈو نچر۔“ مومی کے چکنے پر ہومی نے اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھا (تیرا سارا ایڈو نچر تو تین ایک وار میں نکال کے رکھ دوں گا۔)

\*\*\*

گنے کے کھیت جنہیں عام طور پر ”کماد“ کہا جاتا ہے، اس کے دائیں طرف والی نہر کے قریب ٹریکٹر ٹرالے والے نے انہیں اتارا۔

”ماں جی، پل ذرا کمزور ہے۔ میں اوپر سے چکر کاٹ کے پنڈ تک جاتا ہوں۔ آپ کا رستہ لمبا ہو جائے گا، آپ لوگ ”پلوں پلی“ (پل کے رستے) جاؤ۔ چھ سات منٹ تک پہنچ جاؤ گے، ”کھوہ والی گلی“ تک۔“ انہیں ٹرالے پر ہچکولے لپتے لپتے پتا بھی نہیں چلا کہ کب چلچلاتی دھوپ کی سختی نرم پڑی اور کب ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا میں ادھر سے ادھر اٹھیلیاں کرنے لگیں۔ پل سے لے کر ”کھوہ والی گلی“ تک کا رستہ منٹوں میں طے ہوا۔

”ہا..... ہائے..... چھ سالوں میں میرا پنڈ کتنا بدل گیا ہے۔ اچے اچے پکے مکان، پکی نالیاں..... اور دیکھ ذرا یہ موٹر سائیکلیں۔“

بے بے نے حیرت سے اپنے محلے کا جائزہ لیا۔ وہ تو پھر چھ سال بعد آئی تھیں جبکہ حمید کو آئے تقریباً گیارہ بارہ سال ہو رہے تھے اور وہ اتنا کا کا بھی نہیں تھا جب یہاں



ملنگاں..... اچھا چھوڑیہ ”ستو“ پی لے۔“  
 ”اس میں تو ریت کھلی ہے۔“ ایک اور اعتراض۔  
 ”ناں پتر..... یہ تو شکر ہے، اصلی مرکز کی شکر اور  
 ”ستو۔“ آخر کار اس کے لیے شکر بنجین بنائی گئی جسے اس  
 نے دو بار فلٹر کروایا اور نتیجتاً تب تک ساری برف پگھل  
 گئی اور نمک اور چینی دونوں کی بھرمار اور لمبوں کی شدید  
 کمی کا شکار گرم گرم شکر بنجین اسے زہر مار کرنا پڑی۔  
 بارہ سال پہلے کی اس تلخ یاد نے اس کی پیاس کو  
 مرجھا کر رکھ دیا۔

بے بے گلابی قلعی والی دیواروں اور ہرے رنگ  
 کے بڑے سے دروازے والے گھر کے آگے کھڑی ہو  
 گئیں۔

”لگتا تو یہی ہے، تاجاں نے بتایا تو تھا کہ باہاشم نے  
 دکوٹھے برود کمرے ڈلوائے ہیں اور گلابی قلعی بھی کروائی  
 ہے۔“

آنگن میں لگے آم، جامن اور امرود کے درختوں کا  
 ایک بڑا حصہ باہر گلی میں چھاؤں دے رہا تھا۔ بے بے کو  
 شش و پنج میں دیکھ کے حمید نے خود ہی دستک دے ڈالی۔  
 ”او گاڈ، اتنا سینس نہیں ان لوگوں میں کہ..... گھر  
 کے باہر نیم پلیٹ ہی لگائیں۔“

اس کی بڑبڑاہٹ اس وقت تک جاری رہی جب  
 تک کہ دروازہ نہیں کھل گیا۔ خانوں والے سفید اور  
 خاکی تہ بند اور نمیا لے سے رنگ والی بنیان میں لمبوں ماسی  
 تاجاں کا گھر والا المشہور پاباشم باہر نکلا۔

”آہا بھئی..... جی آیاں نوں.... ساڈی آیاں آئی  
 جے.....“ اس نے یوں آواز لگائی جیسے محلے میں کوئی بچہ  
 اپنے گھر کے آگے کھڑا ہو کے آواز لگائے۔

”چیز ونڈی دی لے لو.....“  
 ”سلام و علیکم انکل۔“ حمید نے سلام کرنے میں  
 پہل کی۔

”و علیکم سلام.... پر پتر میں انکل شکل نہیں تیرا  
 ”ماسٹر“ ہوں۔ تیری ماسی کا بندہ یعنی تیرا ما..... س....  
 ”.....“ باقاعدہ سبجے کر کے باور کرایا گیا پھر نظر اس کے  
 پیچھے کھڑے مومی پر گئی تو حیرانیاں اور پریشانیاں یہاں سے

آیا تھا اس لیے یادداشت میں بارہ سال پہلے والا گاؤں  
 اچھی طرح محفوظ تھا جو کہ بلاشبہ آج کے گاؤں سے خاصا  
 مختلف تھا۔ ”کھوہ والی گلی“ جس ”کھوہ“ یعنی کنویں سے  
 منسوب تھی وہ اب بھی نمایاں تھا البتہ اس کے آس پاس  
 کا کھلا علاقہ اب مکانوں اور دکانوں سے بھر گیا تھا۔ اکثر  
 مکان دو منزلہ اور نیلے، پیلے، گلابی رنگوں سے آراستہ  
 تھے۔ گلیاں ادھ ننگے بچوں سے بھری پڑی تھیں جو آسمان  
 کی طرف منہ اٹھا کر کالے کالے بادلوں کو چلاتے ہوئے  
 خوش آمدید کہہ رہے تھے۔  
 ”کالیاں اٹاں کالے روٹو....“

مینہ بر سادے زور و زور.....“  
 تذور کے ساتھ پی۔ سی۔ او کا بھی اضافہ نیا تھا اور  
 کریانے کی دکان میں رکھا ڈیپ فریزر بھی نظر آ رہا تھا۔  
 ایک دو گھروں کے آگے موٹر سائیکل کھڑی تھی اور تقریباً  
 ہر مکان کے اوپر اینٹینا نصب تھا۔ ڈیپ فریزر اور دکان  
 کے باہر لگے کولڈ ڈرنکس کے اشتہارات دیکھ کر حمید کی  
 پیاس بھڑک اٹھی، ساتھ ہی ایسے بارہ سال پہلے کا واقعہ  
 یاد آ گیا۔ جب وہ ایسی ہی گرمیوں میں یہاں آیا تھا اور  
 المونیم کے جمازی سائز گلاس میں ماسی تاجاں نے اسے  
 جو مشروب پکڑایا تھا اس میں تیرے حشرات الارض کو  
 دیکھ کر وہ چلا اٹھا، گلاس ہاتھ سے چھوٹ کے کچے احاطے  
 میں گر گیا اور گاڑھا گاڑھا مشروب برف کی ڈلیوں سمیت  
 سوکھی مٹی میں جذب ہونے لگا۔

”جو میں..... بے بے..... اس میں جو میں تھیں.....  
 اتنی بڑی بڑی.....“ وہ دہشت سے زمین کی طرف اشارہ  
 کرنے لگا اور وہاں بیٹھا ماسی تاجاں کا سارا بُرجناتی قہقہے  
 لگانے لگا۔

”پتر، یہ جو میں نہیں، یہ تو ”تخ ملنگاں“ کا شربت  
 ہے۔ بڑا ٹھنڈا ہوتا ہے۔ جگر ٹھار دیتا ہے۔ لو میں تو بہت  
 ہی فیدہ دیتا ہے۔“

”میں یہ ملنگوں والا شربت نہیں پیوں گا۔“ اس  
 نے ماسی کی بڑی بیٹی چینی کو ایک اور گلاس بھرتے دیکھ کر  
 مدافعانہ انداز میں ہاتھ ہلائے۔  
 ”ہائے ہائے“ ملنگوں والا نہیں۔ ”تخ

فاسٹ  
 نیلیٹ  
 ڈزن گھٹا  
 ایک ہکس



تقریباً ہم عمر تھے مگر اب شادی کو تین سال ہونے اور دو بچوں کی ماں ہونے کے بعد وہ سچ سچ کی باجی نظر آرہی تھی اور خاصی منڈب اور سلجھی ہوئی بھی۔ اس نے سب سے پوچھ کر ان کا پسندیدہ مشروب گلاس میں انڈیل کر پیش کیا۔ پاباشم اور بے بے کو خوب جھاگوں جھاگ مکھن کی سطح والی نمکین لسی.... ماسی اور ان کے داماد یعنی اپنے مجازی خدا کو بادام کا شربت... اور حمید اور محمود کے لیے روح افزا.....

”آپاں، لسی کے بعد یہ باداموں کا شربت ضرور چکھنا۔ میری پیٹو نے آپوں آپ بنایا ہے۔ بڑا سوادی ہے۔ چھینو، بھائیوں کو بھی دے۔“ اور چھینو نے حمید کا گلاس خالی ہوتے ہی شربت بازام سے بھر دیا۔

”اس میں مغز بھی ڈالے ہیں پھر می لکے لیے اچھے ہوتے ہیں۔“ اس اطلاع پر حمید کو ابکائی آگئی۔

”مم..... مغز..... گائے کا..... یا بکرے کا..... آخ.....“

”پتروہ گوشت والا مغز نہیں، یہ چار مغز.... میوے ہوتے ہیں۔“ بے بے نے مفصل سمجھایا تو بات اس کے مغز میں اتری۔ شربت واقعی مزے دار تھا۔ وہ اکٹھے دو گلاس چڑھا گیا۔ مس پیٹو کی تعریف کرنے کی نیت سے ادھر ادھر دیکھا مگر وہاں موجود تینوں لڑکیوں میں سے پیٹو کون ہے، اس کا اندازہ نہ کر سکا۔ اس کی نظریں ان پر پھسلتی دیکھ کر پاباشم نے زور سے کھٹکھارنا شروع کر دیا۔ جس کو بھانپ کر ماسی نے جلدی سے انہیں چلتا کیا۔

”شادوا بھئی کڑیو، چھتی چھتی کام کرو اور اپنے اپنے گھروں کو جاؤ۔“ پھر بے بے کی طرف متوجہ ہوئیں۔ ”یہ گھڑ مونہی (گھڑے کے منہ والی) پھاتاں ماچھن کی پوتری ہے۔“ انہوں نے مسلسل کھی کھی کرتی میلی سی لڑکی کی طرف اشارہ کیا۔ بے بے نے برا سا منہ بنا کر اسے ”مالکانہ حقوق“ کے ساتھ دیکھا۔

”اور یہ دونوں شریاں (پٹائے) صدیقان نائن کی لڑکیاں ہیں۔ اس ویلے آس پاس کی ساری لڑکیاں میری پیٹو سے پڑھنے آتی ہیں۔“ ٹخریہ انداز میں دی گئی اطلاع پر حمید نے لڑکیوں کا جائزہ لیا کہ کس سے

بھی پڑھنے کی نیت سے آئی نہیں گئی تھیں۔ حمید نے شوکا دیا۔

”پنکی کے بارے میں پوچھو۔“ وہ ان سے گھوری ڈالی۔

”کہیں یہ مس پیٹو ہی تو پنکی نہیں؟“ وہ بھی ایک کائیاں تھا۔ حمید کی شرمسار خاموشی سے شہ پارٹی مار کر مسکراہٹ کے ساتھ سر ہلا کر بڑبڑانے لگا۔

”ہاں بھی۔ جب ڈیڑھ ماہ بے بے اور ڈیڑھ ماہ بے بے کے نیچے پیٹو کیوں نہیں سکتے ہیں تو پنکی کے لیبل کے نیچے پیٹو کیوں نہیں سکتی۔“

”میدے پتر تم آج کل کیا کر رہے ہو؟“ اساتھ دیکھا لگاتے ہو یا دکھا کر کام کرتے ہو؟ ماسی کے سوال پر اسے اچھو لگ گیا۔

”واٹ آئی؟..... میں اور دیہاڑی..... وہ بھی اب کے ساتھ؟ اوہ تو..... امپا سل، اتا پڑھ لکھ کے کیا میں سب کروں گا؟ آفزر آل آئی ایم گریجویٹ۔“

ماسی منہ کھولے اسے دیکھتی رہیں۔ پاباشم نے فوراً پیش کش کی۔

”وٹ؟..... وٹ پڑ رہا ہے پیٹ میں؟ پھکی (چورن) دوں؟“

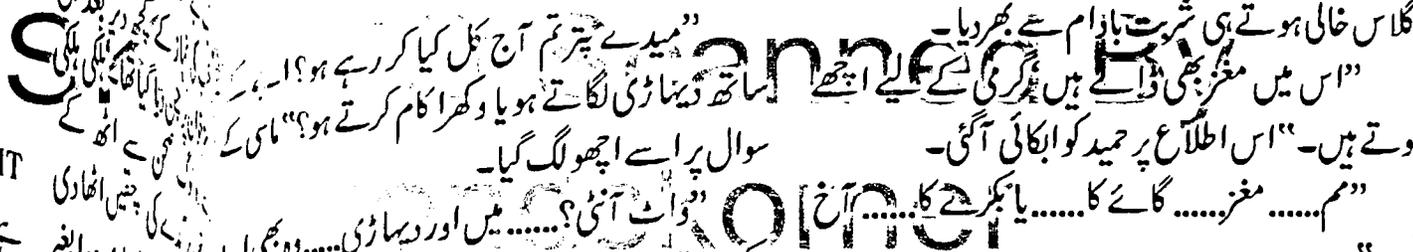
”نو..... تمھینک یو انکل۔“ بڑے تکلف سے انکار کیا۔

”آپاں.....“ خود پر قابو پاتے ہوئے ماسی نے.... بے بے کو متوجہ کیا۔ ”یہ جو تیرا پتر ہے ناں..... بالکل ایسی ہی ایک اور چیز بھی آج کل میرے گھر آئی ہوئی ہے۔“

”چل نی، مخول نہ کر، یہ تو دکھری ٹائپ ہے، ایسا کوئی دوسرا کیسے ہو سکتا ہے۔“ پتا نہیں بے بے نے تعریف کی تھی یا.....

”رب دی سوں، میری مرید کے والی ننان (نند) بھی..... پر سوں سے آئی ہوئی ہے پورا مبرلے کر اور اس کی جو کئی..... دھی ہے ناں..... بل..... کل..... یہی چیز ہے۔ ایسے ہی..... ناسیں (تھنے) چڑھا چڑھا کے انگریجی مارتی ہے۔ ماں پو..... کھ کھ سمجھتے ہیں نہ.....

جانب نہیں خورنے کی بیٹی اپنے پتروں کر کے آئی ہے۔ ”اچھا اچھا ماسی آجاں کی کھڑے دہائے آفزر آفزر ساتھ گردن موڑنے کا سوٹ کلف۔ اندام، کٹے ہوئے اپنے لباس سے ”آؤ پتر بڑا ”او گاڈ آفزر SIT کر جائیں تو ہے۔ گاڈ گاڈ کر گیا۔ ”لیڈر..... کیا جو خیر سے ”اولیس..... ہی رہے تھے کہ تاج، آج کیا لکھ گویا شتر اینڈ شوٹی نیٹوز بھی ہیں کر سکتی مجھے کاٹ لالی پاپ کی ایم گریجویٹ... کاٹ کر کھانا چا واپس پلیٹ میں ”کیا ہوا اپنے نند خالہ خورشید آفزر.....



محمود

ہے۔

”ہے کدھروہ نمونہ؟“

”اپنی ماں کے ساتھ باہر نکلی ہوئی ہے۔“

”واؤ..... ایک اجنبی حسینہ سے ملاقات کا بھی

امکان ہے۔“ محمود نے پھر اس کے کان میں سرگوشی کی۔

خود میدا بھی اس غائبانہ ذکر سے متاثر ہو گیا تھا۔

”ضرور میری طرح کوئی پڑھی لکھی مہذب لڑکی ہو

گی۔“ رائے قائم کی گئی ”ڈھیر سارے نک کسٹوں میں

ناک والا کمو ہی کھلائے گا..... چہ چہ..... بے چاری

لڑکی..... میری طرح ناقدری کا شکار ہے۔“

”سلامان.....“ دھڑلے سے دروازہ کھلا اور

طوفان میل کی طرح ایک بے تحاشا پھیلی ہوئی خاتون

اندر داخل ہوئیں۔ مغرب کی نماز کے کچھ دیر بعد ہی

رات کا کھانا لے سے دسترخوان پر چن دیا گیا تھا۔ ہلکی ہلکی

بوند باندی کی وجہ سے وہ لوگ صحن سے اٹھ کے

برآمدے میں چلے آئے تھے۔ برآمدے کی چھتیں اٹھادی

گئیں تھیں اور پھواروں سے بھیگی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا بغیر

کسی رکاوٹ کے اندر تک آرہی تھی۔ بوند باندی تو چند

منٹ بعد رک گئی مگر موسم کو خوشگوار کر گئی۔ ابھی اندھیرا

پوری طرح پھیلا نہیں تھا کہ کھانے کی تیاری شروع ہو

گئی حالانکہ حمید اور محمود دونوں دس بجے سے پہلے رات

کا کھانا نہیں کھاتے تھے لیکن کھانے کا منع کرنے سے

چند ہی سیکنڈ پہلے پیٹ میں چوہوں کی ریس شروع ہو گئی

اور وہ بیبے بچوں کی طرح چپ چاپ دسترخوان پر آلتی

پالتی مار کر بیٹھ گئے۔ حمید کو شدید بھوک کے اچانک

غلبے کے باوجود ڈنر سے کچھ زیادہ توقعات نہیں تھی۔ اس

کے خیال میں گاؤں کا ائمہ مشورہ سروسوں کا ساگ اور مکئی کی

روٹی ہوگی سویت ڈش میں گڑ والے چاول لیکن سامنے

سلتے سے بچے مرغ پلاؤ، پالک گوشت اور شامی کباب

نے اس کا جی خوش کر دیا۔ سلا د اور رائتے کے لوازمات

بھی ہمراہ تھے۔ کھانے کے بعد وہ لوگ برف میں لگے

دوسری آم چوس رہے تھے، جب ان خاتون کی آمد ہوئی۔

”ہاہائے بھر جانی، اتنی بھی کیا بھوک پڑی ہوئی تھی“

اسے اس کو پوچھوں کا بھی انتظار نہیں کیا اور روٹی کھالی۔“ اسے

خالی پلیٹیں اور ڈونے دیکھ کے غشی پڑ گئی، اس کی توجہ اب

تک گھر کے افراد میں ہونے والی تین رکنی اضافے کی

جانب نہیں گئی تھی۔

”نہیں خورشید، ایسی بات نہیں۔ یہ میرے چاچے

کی بیٹی اپنے پتروں کے ساتھ لہور سے اتنا لمبا پینڈا (سفر)

کر کے آئی ہے مجھے اڑیک کے ہی روٹی کھولی ہے۔“

”اچھا اچھا..... پیکے (میکے) آئے ہوئے ہیں۔“

ماسی تاجاں کی خربلی اور روزنی نندنے ابھرا چکا۔

”ہائے آنٹی۔“ ایک چہکتی آواز پر حمید نے بے

ساختہ گردن موڑی۔ اور جگ اور گہرے جامنی پرنٹ کالان

کا سوٹ کلف سے اگڑا ہوا تھا اور پلٹے قامت، فریب

اندام، گھٹے ہوئے اور بکھرے بالوں والی وہ سانولی سی لڑکی

اپنے لباس سے کہیں زیادہ کلف زدہ لگ رہی تھی۔

”او گاڑ آئی، یونو... مائی مام... ایک PLACE

SIT کر جائیں تو پھر انہیں STAND کرنا مشکل ہو جاتا

ہے۔ گاڑ گاڑ کر کے انہیں STAND کیا تو لیدر خراب ہو

گیا۔“

”لیدر.....؟“ بیسنو کے چھوٹے بھائی لالو نے سوال

کیا جو خیر سے اب آٹھویں چڑھ گیا تھا۔

”اولیں..... لیدر..... آئی مین موسم۔ ہم آؤٹ ہو

ہی رہے تھے کہ RAIN کی وجہ سے اسٹاپ ہونا پڑا۔ آنٹی

تاج، آج کیا لک کیا ہے... واؤ... چکن پی لاؤن..... ساگ

گو شتر اینڈ شومی کبابز۔ ویری ٹیسٹی..... ویری گڈ کولڈ کولڈ

مینگوز بھی ہیں.... لیکن آنٹی اس طرح مینگو نہیں ایٹ

کر سکتی مجھے کاٹ کر دیں۔ آفٹر آل آئی ایم ایف اے۔“

لالی پاپ کی طرح آم چوستا حمید رک گیا۔ ”اینڈ آئی

ایم گریجویٹ..... پھر میں کیوں چوس رہا ہوں۔ مجھے بھی

کاٹ کر کھانا چاہیے۔“ یہ خیال آتے ہی اس نے آم

واپس پلیٹ میں رکھ دیا۔

”کیا ہوا پترا اور آم ”پولا“ (نرم) کر دوں؟“ ماسی کی

مند خالہ خورشید سے ملنے ملانے میں مصروف بے بے بنے

آفر کی۔

”یہ کون ہیں؟ ہمارا تعارف ہی نہیں کروایا۔“

SKOPOL Friends

مائی نہیں لگتی تھیں۔ محمود نے

س پوچھو۔ ”وہ ان سنی کر گیا

ت سے شوکا دیا جو اب حمید نے

دہی تو پینکی نہیں؟“ وہ بھی ایک

سار خاموشی سے شہ پارک کر

سہرہ ہلا کر بڑوانے لگا۔

سیرام بے بے اور ڈیڈ اباجی لگا

س کے نیچے بیٹو کیوں نہیں،

ج کل کیا کر رہے ہو؟ ابے لگا

یا وکھرا کام کرتے ہو؟“ مائی

یا۔

میں اور دیساڑی..... وہ بھی اب

سپاسل، اتنا پڑھ لکھ کے کیا

آئی ایم گریجویٹ۔“

اسے دیکھتی رہیں۔ پاپاشم نے

وٹ پڑ رہا ہے پیٹ ماما

”

لک یو انکل۔“ بڑے تکلف

نود پر قابو پاتے ہوئے مائی نے

جو تیرا پتر ہے ناں..... بالکل ایک

کل میرے گھر آئی ہوئی ہے۔“

نہ کر یہ تو وکھری ٹاپ ہے، ایسا

ہے۔“ پتا نہیں بے بے نے تعریف

میری مرید کے والی ننان (نندا)

ہے پورا نمبر لے کر اور اس کی

..... کل..... یہی چیز ہے۔ ایسے

چڑھا کے انگریجی مارتی ہے۔ مائی

س۔ سارے پنڈ سے اس کو بو

ہے۔“

”ہے کدھر وہ نمونہ؟“

”اپنی ماں کے ساتھ باہر نکلی ہوئی ہے۔“

”واؤ..... ایک اجنبی حسینہ سے ملاقات کا بھی

امکان ہے۔“ محمود نے پھر اس کے کان میں سرگوشی کی۔

خود میدا بھی اس غائبانہ ذکر سے متاثر ہو گیا تھا۔

”ضرور میری طرح کوئی پڑھی لکھی مہذب لڑکی ہو

گی۔“ رائے قائم کی گئی ”ڈھیر سارے نک کٹوں میں

ناک والا کتو ہی کھلائے گا..... چہ چہ..... بے چاری

لڑکی..... میری طرح ناقدری کا شکار ہے۔“

”سلا ماں.....“ دھڑ سے دروازہ کھلا اور

طوفان میل کی طرح ایک بے سٹا شا پھیلی ہوئی خاتون

اندر داخل ہوئیں۔ مغرب کی نماز کے کچھ دیر بعد ہی

رات کا کھانا لے سے دسترخوان پر چن دیا گیا تھا۔ ہلکی ہلکی

بوند باندی کی وجہ سے وہ لوگ اصرح لے اٹھ کر

برآمدے میں چلے آئے تھے۔ برآمدے کی چھتیں اٹھادی

گئیں تھیں اور پھواروں سے بھیگی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا بغیر

کسی رکاوٹ کے اندر تک آرہی تھی۔ بوند باندی تو چند

منٹ بعد رک گئی مگر موسم کو خوشگوار کر گئی۔ ابھی اندھیرا

پوری طرح پھیلا نہیں تھا کہ کھانے کی تیاری شروع ہو

گئی حالانکہ حمید اور محمود دونوں دس بجے سے پہلے رات

کا کھانا نہیں کھاتے تھے لیکن کھانے کا منع کرنے سے

چند ہی سیکنڈ پہلے پیٹ میں چوہوں کی ریس شروع ہو گئی

اور وہ بیبے بچوں کی طرح چپ چاپ دسترخوان پر آلتی

پالتی مار کر بیٹھ گئے۔ حمید کو شدید بھوک کے اچانک

غلطے کے باوجود دُز سے کچھ زیادہ توقعات نہیں تھی۔ اس

کے خیال میں گاؤں کا المشہور سروسوں کا ساگ اور مکئی کی

روٹی ہوگی، سویٹ ڈش میں گڑ والے چاول لیکن سامنے

سلتے سے بچے مرغ پلاؤ، پالک گوشت اور شامی کباب

خالی پلیٹیں اور ڈونے دیکھ کے غشی پڑ گئی، اس کی توجہ اب

تک گھر کے افراد میں ہونے والی تین رکنی اضافے کی

جانب نہیں گئی تھی۔

”نہیں خورشید، ایسی بات نہیں۔ یہ میرے چاچے

کی بیٹی اپنے پتروں کے ساتھ لہور سے اتا لبا پینڈا (سفر)

کر کے آئی ہے تجھے اڑیک کے ہی روٹی کھولی ہے۔“

”اچھا اچھا..... پیکے (میکے) آئے ہوئے ہیں۔“

ماسی تاجاں کی خیرلی اور وزنی نندنے ابرو اچکائے۔

”ہائے آئی۔“ ایک چمکتی آواز پر حمید نے بے

ساختہ گردن موڑی۔ اور ج اور گھرے جامنی پرنٹ کالان

کا سوٹ کلف سے اکڑا ہوا تھا اور پستہ قامت، فریب

انداز، کئے ہوئے اور اکھڑے بالوں والی وہ ساتویں ہی لڑکی

اپنے لباس سے کہیں زیادہ کلف زہ لگ رہی تھی۔

”اوپر بڑی دیر لگا دی۔“

”اؤ گاؤ، آئی، تو نا..... مائی مام..... ایک PLACE

SIT کر جائیں تو پھر انہیں STAND کرنا مشکل ہو جاتا

ہے۔ گاؤ گاؤ کر کے انہیں STAND کیا تو لیدر خراب ہو

گیا۔“

”لیدر.....؟“ بیٹو کے چھوٹے بھائی لالو نے سوال

کیا جو خیر سے اب آٹھویں چڑھ گیا تھا۔

”اولیں..... لیدر..... آئی مین موسم۔ ہم آوٹ ہو

ہی رہے تھے کہ RAIN کی وجہ سے اسٹاپ ہونا پڑا۔ آئی

تاج، آج کیا لک کیا ہے... واؤ... چکن پی لاؤنز..... ساگ

گو شتر اینڈ شو می کبابز۔ ویری نیسی..... ویری گڈ کولڈ کولڈ

مینگوز بھی ہیں..... لیکن آئی اس طرح مینگو نہیں ایٹ

کر سکتی مجھے کاٹ کر دیں۔ آفٹر آل آئی ایم ایف اے۔“

لالی پاپ کی طرح آم چوستا حمید رک گیا۔ ”اینڈ آئی

ایم گریجویٹ..... پھر میں کیوں چوس رہا ہوں۔ مجھے بھی

کاٹ کر کھانا چاہیے۔“ یہ خیال آتے ہی اس نے آم

واپس پلیٹ میں رکھ دیا۔

”کیا ہوا پتر اور آم ”پولا“ (نرم) کر دوں؟“ ماسی کی

نند خالہ خورشید سے ملنے ملانے میں مصروف بے بے نے

آفر کی۔

”یہ کون ہیں؟ ہمارا تعارف ہی نہیں کروایا۔“

نارنجی اور جامنی شیڈ دیتی انگلش میڈیم حسینہ نے سرگوشی کرنے کی کوشش کی جو ظاہر ہے ناکام رہی۔  
 ”یہ شکایت تو ہمیں کرنی چاہیے۔“ محمود عرف مومی نے جواباً ایک اور ناکام سرگوشی کی۔  
 ”یہ دونوں تمہارے منڈے ہیں۔“ خالہ خورشید نے نہ جانے کیوں مشکوک سی نظروں سے مومی کو دیکھا۔  
 ”اپنے ہی سمجھ لو، ویسے یہ میدا ہے اور یہ میرے میدے کالنگوٹیا.....“

لفظ ”لنگوٹیا“ پر دونوں جی بھر کے بد مزہ ہوئے۔ حمید نے تو سخت برامانتے ہوئے احتجاج بھی کیا۔  
 ”کیسا لنگوٹیا بے بے... یہ میرا کالج فیلو تھا اور کالج میں، میں لنگوٹیا پن کر نہیں جاتا تھا۔“  
 ”آپ کون سے کالج میں تھے؟“ اسی کلف زدہ نے دلچسپی لی۔

”ڈی ایس کالج لاہور سے گریجویشن کیا ہے“ اس نے دانستہ دیاں سنگھ کا نام نہیں لیا۔  
 ”اچھا..... ویری گنڈ..... میں نے گورنمنٹ ڈگری کالج مرید کے سے ایف اے کا امتحان دیا ہے۔“  
 ”ایک بار پھر۔“ لالو نے لقمہ دیا۔  
 ”میرا نیم میری ہے اور آپ کا؟“  
 ”حمید جنجوعہ ویسے آپ مجھے ہومی کہہ سکتی ہیں اور یہ میرا بیسٹ فرینڈ مومی۔“

”مومی؟..... واؤ..... مومی رانا؟“ وہ چلائی۔  
 ”لا حول ولا...“ حمید اس موازنے پر برا سامنہ بنا کر رہ گیا۔ ”یہ تو رانا سنگا سے بھی گیا گزرا ہے۔“  
 ”لے..... یہ مومی کیا نام ہوا، موم بتی.....؟“  
 ”جی اصل نام تو میرا محمود ہے..... محمود بٹ۔“  
 ”محمود بٹ..... بٹوں کا منڈا تو نہیں لگتا تو؟“ خالہ خورشید اب تک مشکوک تھیں۔

”بٹوں کے تو“ کئے“ (بھینسے) بھی چٹے ہوتے ہیں۔ ایسا کالا بٹ تو نہ دیکھا نہ سنا..... ہاں ادھر کامونکے میں میری بہن ویبا ہی گئی تھی وہاں اس کے بندے کا ایک بلی (دوست) تھا۔ وہ بھی راج کے کالا تھا اور خود کو بٹ بھی کہتا تھا، جاوید بٹ۔“

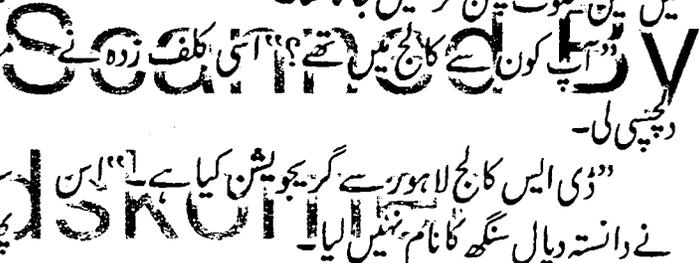
”امیزنگ! مومی کے پایا کا نام بھی جاوید بٹ ہے۔“ حمید نے اطلاع دی۔  
 ”اور ماں کا نام کنیزاں، وڈی دھی پوریوالہ ویبا ہی ہے اور تم لوگ چھ بہن بھائی ہو۔ سے ناں.....“  
 کہوں تیری شکل دیکھی بھالی کیوں لگ رہی ہے اجنبی پچھلے سال تو کامونکے گئی تھی گنڈو کے عقیقے پہاں تیرا سارا ٹمبر ہفتہ پہلے سے مفت کی روٹیاں کھانے آیا ہوا تھا۔ تو تو اچھا بھلا ”مودا“ ہوتا تھا یہ مومی شوی کب سے ہو گیا۔“

”لیکن آنٹی، مومی کے پایا تو بہت مصروف آدمی ہیں۔ اپنا سارا کام دھندا اچھوڑ کر کامونکے اتنے دن کیسے رہنے جا سکتے ہیں؟“ ”مودا“ دسری آم اپنے بھاڑے منہ میں ٹھونس کر جو سنا بھول گیا۔  
 ”رفخ.... کام دھندا.... وہ جدھر جاتا ہے اپنا کام ساتھ اٹھائے پھرتا ہے۔ چھ شیشیاں تو ہوتی ہیں، چھکانی پھرتا ہے۔“

”رفخ.... کام دھندا.... وہ جدھر جاتا ہے اپنا کام ساتھ اٹھائے پھرتا ہے۔ چھ شیشیاں تو ہوتی ہیں، چھکانی پھرتا ہے۔“  
 ”لوگوں کی۔“  
 ”اوہ..... اوہ..... اوہ.....“ حمید معاملے کی تک پہنچ گیا۔ ”ہاں جی، بتایا تھا مودے نے کہ اس کے پایا لوگوں کی تھکان، پریشانی اور دکھ درد کا علاج کرتے ہیں۔ جو ان کے پاس آتا ہے، ہلکا پھلکا ہو کر واپس جاتا ہے۔“  
 ”اور مودے سنا، پتا چلا ہے تیری ماں کنیزاں نے شہر میں ”وچولن“ (رشتے کرانے والی) کا کام شروع کر دیا ہے؟“

”ہاں جی، یہ ہی بتایا تھا کہ وہ لوگوں کے مسئلے مسائل حل کراتی ہیں۔“  
 ”پنڈ میں تو ساری حیاتی لوگوں کی طلاق ہی کرواتی رہی ہے۔“ خالہ نے متاثر ہوئے بغیر ہلکا کر مزید گویا افشانی کی۔

”ایسی بات نہیں آئی ہے۔ اچھو سلی گاؤں میں ان کے ٹیلنٹ کو ابھرنے کا موقع نہیں مل سکا ہو گا۔“  
 ”ہے ناں... مودے.....!“ حمید نے بھولہ پن سے جھپکاتے ہوئے اس سے پوچھا، ”جواباً وہ پکا منہ کر کے بولے۔“  
 ”ہنڈر ڈپر سنٹ رائٹ..... میدے!“



میں نے اسے ہمیشہ سالا ہی سمجھا ہے۔ سوہروں (سرایلوں) کو اپنا آپ دکھانا چاہیے، یہ جو ایوں کا حق ہوتا ہے۔" ان کی اپنی منطق تھی۔ محسن بھائی نے مزید بحث میں وقت ضائع کرنے کے بجائے ہنس کے ٹالا۔ البتہ حمید ان کی سادگی، متانت اور روشن خیالی سے متاثر ہو گیا ساتھ ہی ساتھ اسے اپنی ڈھٹائی پر شرم بھی محسوس ہوئی۔ وہ اکیلے ہی اتنے بھاری پلنگ گھسیٹ رہے تھے جبکہ وہ اور محمود بے مقصد "بنیرے" (منڈیر) سے لگے ادھر ادھر تاڑ رہے تھے۔ اس نے فوراً آگے بڑھ کے ان کی مدد کی۔ وہ مشکور نگاہوں سے اسے دیکھنے لگے۔ پلنگ بچھانے کے بعد وہ پیڈل فین سیٹ کرنے لگے جبکہ وہ

منوں وزنی سرہانے اور چچی دودھ چادریں بچھانے لگا جو پلنگ ادھر ادھر کرنے کی وجہ سے خراب ہو گئی تھیں۔ چادروں کے کناروں پر کڑھائی کی بلیں تھیں اور وہ تکیے... جن کے اندر خدا جانے کیا بھرا تھا، مختلف اکلمات و مصرفات سے سجی تھیں۔ وہ بڑھنے لگا۔

"پھوپھاجی یا چاچاجی، ..... جو بھی وہ تھے..... ان کے حصے میں آتے تکیے پر "ننڈیا آجارے آجا....." کندہ تھا۔

محسن بھائی جان کے تکیے پر ہلکے گلابی دھاگے سے "شب بخیر....." لکھا تھا جب کہ تقطے پھولوں کی شکل میں کاڑھے گئے تھے۔ اس نے اپنا تکیہ دیکھا۔

"سرہانے تیرے آہستہ بولو۔"

"کیا دیکھ رہے ہو؟" محسن بھائی جان نے مسکرا کر

کہا۔

"یہ ہماری زوجہ محترمہ کی کارگزاری ہے۔ ایسے ہی لا تعداد شاہکار وہ جینز میں بھی لے کر آئی ہیں اور شاید میکے میں اپنی یاد کے طور پر یہ چند ایک نمونے چھوڑ گئی ہیں..... اور ہاں..... اپنے دوست کو یہاں بلا لو۔ آس پاس کے کئی گھرانے کھلی چھت، صحن یا برساتیوں میں سو رہے ہیں..... اس طرح ناک جھانک سے بے پردگی ہوتی ہے۔"

رات کو بھی ان سے دیر تک گپ شپ رہی اور حمید کو یہ جان کر خوشگوار حیرت ہوئی کہ محسن بھائی پنجاب

اوپر والے دونوں کمروں میں مردانہ مہمانوں کے ٹھہرنے کا انتظام تھا۔ ایک میں تو چھینو باجی کے شوہر اور آئی خورشید کے سر تاج تھے اور دوسرے میں مودا، میدا..... یعنی کہ حمید اور محمود۔ دونوں کمروں کے آگے کھلا برآمدہ تھا، چھت بھی تھی اور سائیڈ کی دیواریں بھی مگر سامنے سے کھلا رکھا ہوا تھا جس کی وجہ سے بڑے سے صحن سے آتی ٹھنڈی ہوا نے سارا برآمدہ اڑکنڈیشنڈ کر دیا تھا۔ چھینو باجی کے شوہر محسن بھائی جان نے تجویز پیش کی۔

"کیوں نہ بستر برآمدے میں بچھالیے جائیں۔ میں تو پچھلے درون سے چھت پر ہی چاریائی ڈال کر سو رہا ہوں، آج موسم ذرا آبرو آلود ہے اس لیے کھلے آسٹیاں لگے بیچنے سونا ٹھیک نہیں، بارش نہ ہوئی تو اس بدن اکڑا دے گی لیکن کمرے میں بھی صحن سونے نہیں دیتے گا۔ چلو برآمدے میں پلنگ گھسیٹ لیتے ہیں۔"

انہوں نے خود ہی لپک جھپک بڑے بڑے رنگین پاپوں والے نواڑی پلنگ گھسیٹ کر برآمدے میں لانے شروع کر دیے۔

"لوجی، وکھرا رواج دیکھا ہے۔" آئی خورشید کے ہم مزاج، میاں نے اوپر آتے ہی اس کارروائی کو تنقیدی نظروں سے دیکھتے ہوئے جملہ اچھالا۔

"جوائی، سوہرے گھر (سراں) آ کے کیوں والے کام کر رہا ہے۔"

"کیوں والے کام؟ پھوپھاجی اپنے کام اپنے ہاتھ سے کرنے میں کیا برائی ہے اور میں اس گھر کا داماد نہیں، بیٹا ہوں۔ یہ صرف میرا سراں ہی نہیں، تائے گا گھر بھی ہے۔ یہ کیوں بھولتے ہیں آپ۔" انہوں نے متانت سے کہا۔

"او چھڈو جی، یہ آج کل کے لڑکے ذرا پڑھ لکھ جائیں تو سارے رواج اور ریتیں ہی بھلا دیتے ہیں۔ تو زمانے سے انوکھا تو نہیں، ہماری ساری برادری میں ہی "اندرو اندری" (آپس میں) رشتے طے ہوتے ہیں۔ تیرا سوہرا (سرا) یعنی میرا سالا میری ماسی کا پتر بھی ہے لیکن

کے پایا کا نام بھی چاروں  
دی۔  
نیراں، وڈی دھی بوریوں  
بھائی ہو۔ سے ٹال.....  
بھالی کیوں لگ رہی  
تھی گڈو کے غلطیے  
سے مفت کی روٹیاں کھانے  
"ہوتا تھا یہ مولی شوئی کی  
کے پایا تو بہت مصروف  
چھوڑ کر کاموں کے اتنے  
دو" دسری آم اپنے ہمارے  
ول گیا۔  
!... وہ جدھر جاتا ہے  
چھ شیشیاں تو ہوتی ہیں  
..... مایشیا ہے، چچی کرنا  
اوہ....." حمید معالے  
یا تھا مودے نے کہ اس  
ر دکھ درد کا علاج کرتے  
پھلکا ہو کر واپس جاتا ہے  
لا ہے تیری ماں کینزاں  
نے والی) کا کام شروع  
تھا کہ وہ لوگوں کے  
لوگوں کی طلاق ہی کر  
ہوئے بغیر ہاتھ ہلا کر منڈ  
ہے۔ اچھو سلی گاؤں  
کا موقع نہیں مل سکا  
ر نے بھولین سے  
ما، جو اب وہ پکا منہ کر کے  
..... میدے!"

کل نارووال میں اپنی زمینوں کو اپنی تعلیم و ہنر سے فیض یاب کر رہے ہیں۔

”تعلیم کوئی بھی ہو، اس کا فائدہ اٹھانا چاہیے بلکہ میں تو کہتا ہوں، اس کا فائدہ دوسروں کو پہچانا چاہیے۔ میں ڈاکٹر بھی بن سکتا تھا، کہیں کسی محکمے میں نوکری بھی کر سکتا تھا۔ اس سے بھی کسی نہ کسی کو فائدہ ہی ہوتا لیکن

میں نے سوچا میری ذات پر سب سے زیادہ حق میرے ماں باپ کا ہے۔ جب ان کو ہی میری ذات سے کوئی سکھ نہیں پہنچے تو ایسی تعلیم کا کیا فائدہ۔ میرے والد ٹیپیکل زمیندار ہیں اور انہوں نے اپنی زمینوں کو جی جان سے سینچا تھا اور میں یہ بھی جانتا تھا کہ میں ان کی اکلوتی اولادِ زرینہ ہوں اگر شہر میں کسی اور کام دھندے سے لگ گیا تو وہ اس عمر

میں کب تک یہ زمینیں اٹھا سکیں گے۔ زمینیں بیچنے کا تصور بھی ان کے لیے جان لیوا ہو سکتا تھا۔ اس لیے میں نے اپنی تعلیم کا رخ زراعت کی طرف موڑا۔ آج میری

زمینیں پہلے کی نسبت تین گناہ منافع دے رہی ہیں اور میرے والد صرف منافع کی وجہ سے نہیں بلکہ اس وجہ سے خوش ہیں کہ میں نے ان کی روایت کو زندہ رکھا۔“

”اور چھینو باجی سے شادی..... میرا مطلب ہے کہ اتنے تعلیم یافتہ ہو کر آپ نے کیسے ایک ان پڑھ..... میرے کہنے کا مقصد.....“

”ہاں میں سمجھ رہا ہوں تم کیا کہنا چاہتے ہو۔ شہناز میرے تایا کی بیٹی ہے اور ہمارے ہاں اپنے ہی اپنوں کا بوجھ بانٹا کرتے ہیں۔ یہ ایسی کوئی لازمی شرط تو نہیں، خاندان سے باہر بھی رشتے ہو جایا کرتے ہیں کبھی کبھار لیکن اگر کوئی مسئلہ درپیش نہ ہو تو پھر بلاوجہ انکار کا کیا جواز؟ شہناز بالکل ان پڑھ نہیں۔ اس نے مل کیا ہے۔ آگے نہ پڑھنے کی وجہ یہ نہیں کہ وہ پڑھنا نہیں چاہتی تھی یا پڑھ نہیں سکتی تھی۔ تب یہاں لڑکیوں کا ہائی اسکول نہیں تھا۔ اس کی شادی ہوئی تو اس کی چھوٹی بہن دسویں

میں تھی کیونکہ تب تک ہائی اسکول بن چکا تھا لیکن دیکھو، اس نے میٹرک کرنے کے بعد اس لیے پڑھائی ترک نہیں کی کہ یہاں گریجویٹ اسکول نہیں۔ پرائیوٹ ایف اے کیا

ہے۔ روز ٹرین میں جاتی ہے، آتی ہے لیکن بڑے زور سے پھر میں ناامید کیوں ہوتا۔ تائی امی بالکل نہیں پڑھیں لیکن بیٹی بی۔ اے تک پہنچ گئی۔ میری بیوی مل کے اٹیجنڈنگ کی تعلیم حاصل کر سکتی۔“

حمید کے لیے یہ انکشاف تھا کہ مس بیٹو کا دل جانی ہیں۔ وہ تو بے بے کے بیان کی روشنی میں اسے سمجھنے لگی تھی ہی سمجھتا رہا۔ غالباً بے بے کی معلومات بیٹو اور چینی کے بارے میں ذرا مکس ہو گئی تھیں۔



”ربا، سو ہنیا مینہ وسا.....“

سباں دی کوٹھی دانے پان.....  
دسکی گھی سے تر بتور دتی راتھے، سوچی کا خوشبو را  
حلوا، آلو انڈے کی بھجیا اور میٹھی لسی کے بھاری ناشے

سے خوب سیر ہونے کے بعد وہ دودھ جی کا گم ہاتھ میں لے کر صحن میں ٹہل رہا تھا۔ ناشتا ٹھونس تو لیا تھا گراں طبیعت کی گرانی کسی ایک جگہ تک کر بیٹھے نہیں دے رہی تھی۔ دودھ پتی کی پہلی چسکی لیتے ہی الاچی کی بھر پور منک اور ذائقہ اسے بے اختیار چائے بنانے والے ہاتھوں کو دعائیں دینے پر مجبور ہو گیا۔ اس وقت ایسی ہی کسی ہانسم چیز کی اشد ضرورت تھی۔ وہ گم ہاتھ میں لیے اوپر جانے کو تھا جب مدھم سُروں میں گنگٹانے کی آواز سے چونک گئی۔ اس نے پلٹ کر دیکھا اور دھیرے دھیرے اس

جانب بڑھنا شروع کیا جہاں سے بڑے شدوید کے ساتھ ”مینہ برسائے اور دانے ڈالنے“ کی دعائیں کی جا رہی تھیں۔ ہلکے نیلے کاٹن کے شلوار قمیص میں ملبوس سفید لملل کا دوپٹا سر پر اوڑھے جس کے چاروں جانب نیلے کروشے کی نیل تھی، وہ جو بھی تھی، بلاشبہ مسور کن آواز کی مالک تھی۔

”کون ہو سکتی ہے؟ مس بیٹو تو غالباً مجھ سے پردہ کر رہی ہیں یا پھر شاید ان سے پردہ کرایا جا رہا ہے، اس لیے وہ تو نہیں ہو سکتیں۔ مس میری کے نہ تو بال اتنے پائے اور ریشمی ہیں نہ ہی قد و قامت اتنی موزوں و متناسب

”کون ہو سکتی ہے؟ مس بیٹو تو غالباً مجھ سے پردہ کر رہی ہیں یا پھر شاید ان سے پردہ کرایا جا رہا ہے، اس لیے وہ تو نہیں ہو سکتیں۔ مس میری کے نہ تو بال اتنے پائے اور ریشمی ہیں نہ ہی قد و قامت اتنی موزوں و متناسب

”نی مشتری، مشتری..... عقل نون ہتھ پا..... یہ فیشن سنس کام آتے۔ جاچ (ہنر) فیدہ دیتی ہے۔“  
 ”پلیزم نام..... مشتری نہ کہا کریں، میری ہے میرا نام۔“

حمید کی ہنسی چھوٹ گئی۔ ”میری..... مشتری.....“  
 اس نے بمشکل اپنے قہقہے کا گلا گھونٹا۔ اچانک اسے لگا جیسے وہ اس پر نہیں خود پر ہنس رہا ہے۔

”حمید..... ہومی..... میدا۔“ شرمسار سا ہو کر وہ محسن بھائی جان کے پیچھے چل پڑا جو اپنے تایا جان..... پاشم کی خصوصی دعوت پر ان کی فصلوں کا جائزہ لینے آئے تھے۔ جو پچھلے سال کی نسبت کم زر خیزی دے رہی تھیں۔ ان کے ساتھ سارا دن فصلوں، کھیتوں پر گزار کے.....

کئی ایک قابل کاشت کاروں سے مل کر اسے اندازہ ہوا کہ بہت سے محسن بھائی جان اپنی تعلیم سے اپنی دھرتی کی گود ہری کیے ہوئے تھے۔ بہت سے بچے ان بڑھ گنوار کسان اپنے اپنی نسبت کہیں زیادہ با علم لگے۔ کم از کم وہ کچھ تو جانتے تھے..... بیجوں کے بارے میں ہی سہی، چاہے کیڑے مار ادویات کے بارے میں ہی سہی... مگر کسی چیز کا علم تو رکھتے تھے۔

”اور میں کیا ہوں! مجھے کیا آتا ہے؟ کیا جانتا ہوں میں یہ میرا اصل ہے، میرے دادا، پردادا سبزیاں اگاتے رہے۔ میرے باپ نے ساری عمر سبزیاں بیچیں اور میں اتنا بھی نہیں جانتا تھا کہ توری بیل پر لگتی اور آلو کے درخت نہیں ہوتے بلکہ زمین کے اندر اگتے ہیں۔ دھان کو کب، کیسے اور کتنا پانی دیتے ہیں، یہ بھی نہیں جانتا..... ہمیشہ خود کو ”گریجویٹ“ کہہ کہہ کر داد دیتا رہا..... لیکن میری گریجویشن نے کسی کو کیا فائدہ پہنچایا؟ کسی کو چھوڑو، خود مجھے کیا فائدہ پہنچایا؟ اسلامیات اور ہسٹری جیسے آسان مضامین کے رٹے لگا لگا کر اور کپارٹس لے لے کر میں نے بی۔ اے کر تو لیا مگر اسلامیات..... کیا مجھے چھ کلمے بھی پورے آتے ہیں؟..... کیا اسلامیات کی کتابیں اتنے سالوں پڑھنے کے بعد بھی میں نے جمعے کی نماز بغیر بے بے کی ڈانٹ کے پڑھی ہے، باقی نمازیں تو خیر..... اور ہسٹری..... بوٹیاں اور رٹے..... دونوں امتحانی مرکز سے باہر

ہے۔ یہ سادہ سا انداز، یہ مدھر سُروں والی آواز اور یہ سبک ہاتھ پیر مس میری کے ہو ہی نہیں سکتے۔“ اس نے لاجب انگلیوں والے بغیر کسی موزوں آرائش والے ہاتھ اور گول گول کبوتر کے رنگ والی ایڑیوں کو دیکھ کے سوچا۔  
 ”باجی چھینو.....؟ یا پھر کل والی ”شرکیوں“ میں سے کوئی ایک؟“ وہ ہنوز رخ موڑے موٹیے کی کلیاں چن چن کر مٹی کے پیالے میں بھر رہی تھی۔ اپنا کام مکمل کر کے جیسے ہی اس نے رخ پھیرا تو سامنے حمید کو دیکھ کر چونک گئی۔ ہلکی ہلکی نمی لیے بالوں پر سے سفید دوپٹا ذرا سا سرک گیا۔ اس نے ایک کان کے پیچھے پلو اڑتے ہوئے سلام جھاڑا۔ حمید حیرت زدہ سا اس دھلے دھلے معطرو مصفا وجود کو دیکھ رہا تھا۔ جب تک وہ حواسوں میں آ کے

سلام کا جواب دینے کے قابل ہوتا، وہ واپس پلٹ گئی۔  
 ”ہینو..... نی بیٹو، تیری ماسی کو تیرے ہاتھ کی لالچکی والی دودھ پتی بڑی پسند آتی ہے، ایک کپ اور بنا کر لا۔“  
 ”جی اچھا امی جان۔“ وہ کچن کے اندر گھس گئی۔  
 ”ہینو..... اور یہ؟..... سربرا رنگ.....“

امیزنگ..... بے بے کی چوائس اتنی فنٹاشک ہو سکتی ہے۔ اس کا تو اندازہ بھی نہیں تھا مجھے۔ خیر بے بے کا بھی کیا کنٹری یوشن، میری لک ہی گڈ لک ہے۔ اتنا تو میں ڈیزرو کرتا ہوں آفٹر آل آئی ایم گریجویٹ۔“

”ہینو باجی۔“ میری نے چن میں جھانکا۔  
 ”آپ جانتی ہیں کہ میں ملک پتی نہیں ڈرنک کرتی۔ مجھے ذرا اسٹرونک نی بنا کر دیں اور شوگر بھی کم ڈالیں، اونٹنی تھری اسپون۔“ لاڈ سے فرمائش کی گئی۔  
 ”نی کڑیے، شرم دا گھانا، کبھی خود بھی کوئی ہاتھ پیر بلا لیا کر۔“ اس کی والدہ محترمہ نے فلمی انٹری دی۔  
 ”تیرے سے دو سال چھوٹی ہے ہینو اور سارے کام کاج میں ہیشار ہے۔ سلائی کڑھائی، پکانا سجانا..... پڑھتی بھی ہے تیرے نخرے کم نہیں ہوتے۔“

”اوہ، پلیزم نام۔“ وہ پیرنچ کر رہ گئی۔ کہاں تو وہ ابھی اتنے ننھے پن سے اسے باجی پکار رہی تھی اور کہاں اس کی منہ پھٹ اور خطرناک حد تک صاف گوام نے اس کی دو سال کی بڑائی کا بھانڈا چھوڑ دیا۔

”اوہ، پلیزم نام۔“ وہ پیرنچ کر رہ گئی۔ کہاں تو وہ ابھی اتنے ننھے پن سے اسے باجی پکار رہی تھی اور کہاں اس کی منہ پھٹ اور خطرناک حد تک صاف گوام نے اس کی دو سال کی بڑائی کا بھانڈا چھوڑ دیا۔

س اباد کے کٹر کالج سے لیا  
 زٹرین میں جاتی ہے، آتی ہے  
 امید کیوں ہوتا۔ نائی امی بالکل  
 بی۔ اے تک پہنچ گئی۔ میری کیوں  
 نی ہے پھر میری بیٹی کیوں نہیں  
 کی تعلیم حاصل کر سکتی۔“  
 کے لیے یہ انکشاف تھا کہ مس  
 بے بے کے بیان کی روشنی میں اسے  
 ہتھارتا۔ غالباً بے بے کی معلومات  
 میں ذرا مکس ہو گئی تھیں۔



”سو ہنیا مینہ وسا.....“  
 سادی کو ٹھی دانے پا.....“  
 گھی سے تربتورنی پراٹھے سونگی کا  
 نڈے کی بھجیا اور میٹھی لی کے  
 سیر ہونے کے بعد وہ دودھ پتی کا ک  
 ن میں نسل رہا تھا۔ ناشتا ٹھونس تو  
 گرانی کسی ایک جگہ تک کر بیٹھے  
 ہ پتی کی پہلی چسکی لیتے ہی لالچی کی  
 اسے بے اختیار چائے بنانے والے  
 پینے پر مجبور ہو گیا۔ اس وقت ایسی  
 ضرورت تھی۔ وہ گگ ہاتھ میں لے  
 مدھم سُروں میں گنگٹانے کی آواز  
 نے پلٹ کر دیکھا اور دھیرے دھیرے  
 تنا شروع کیا جہاں سے بڑے شدہ  
 مانے اور دانے ڈالنے کی دعا  
 لے نیلے کاشن کے شلوار قمیص میں  
 بنا سر پر اوڑھے جس کے چاروں  
 بیل تھی، وہ جو بھی تھی، بلاشبہ  
 می۔  
 ن ہو سکتی ہے؟ مس ہینو تو غالباً  
 پھر شاید ان سے پردہ کرایا جا رہا  
 ہو سکتیں۔ مس میری کے نہ تو  
 ہیں نہ ہی قد و قامت اتنی موزوں

آنے کے بعد وہیں چھوڑ آیا کرتا تھا۔

”مجھے تو اپنے خاندان کی ہسٹری نہیں یاد، مغلیہ اور عباسیہ خاندان کی ہسٹری کہاں یاد رہتی۔ اس ڈگری کے بغیر میں کیا ہوتا..... اس کے ساتھ بھی میں کچھ نہیں ہوں اور اس میں قصور ڈگری کا نہیں، میرا ہے... میرا، جس نے اس سے فائدہ نہیں اٹھایا۔ ہمیشہ کلر کی پر لعت بھیج کر افسری اور کیشنری کے خواب دیکھتا رہا۔ کیا کلرک انسان نہیں ہوتے..... کیا سبزی فروش حق حلال کا نہیں کھاتے..... کیا کوئی پیشہ باعزت نہیں ہے؟ کیوں نہیں ہے جس کام سے چار لوگوں کے حلق میں نوالہ اترتا ہو باعزت کیسے نہیں ہو سکتا۔ یہ پھٹی اڑیوں والے، سنگلاخ ہتھیالیوں والے محنت کش کسان، منہ اندھیرے.....

ننگے پیر دھان کو اپانی لگانے والے، زہریلے سانپوں کے ڈنگ لکھتے ہیں، کڑا لکے کی سردیوں میں پللیاں اجماعے ہیں۔ پتی آگ سی دوپہروں میں ننگے بدن مل جوتے ہیں..... میں تو شاید ان کے مقام تک کبھی نہیں پہنچ سکتا۔ ان کی قدر تو پاباشم اور محسن بھالی جیسے لوگ ہی جان سکتے ہیں۔“

کبھی وہ ایسے لوگوں میں اٹھا بیٹھا ہی نہیں تھا۔ ابا تھا تو اپنے کام سے کام رکھنے والا، گھر آکر تمباکو والے حقے کے کش لگا کر سارے دن کی تھکن اتارتا اور بے سدھ سو جاتا۔ بیٹے کے اطوار و تعلیم کے آگے احساس کمتری اور مرعوبیت کا شکار ہو کر اس نے کبھی اسے سمجھانے بچھانے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی تھی۔ اس کے خیال میں بیٹے کو اتنی تعلیم دلا دی..... اب سمجھانا کیا، خود ہی سمجھ والا ہو گیا ہے۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ تعلیم کے ساتھ تربیت ہمیشہ لازم و ملزوم رہی ہے۔

بے بے کے دو کام تھے، بے تماشلا لاڈ اور اندھا دھند پھنکار۔ دونوں فرائض وہ اپنے موڈ کے مطابق انجام دیتی اور خاصی دلجمعی کے ساتھ مگر یہ دونوں حمید کے کسی کام نہ آسکے بلکہ اس کی شخصیت میں اور بگاڑ لانے کا سبب بنے۔ لاڈ نے اسے خود سر، خود پسند اور کم عقل بنا ڈالا..... اور پھنکار نے ڈھیٹ، بے غیرت اور خود غرض۔

آج شاید پہلی بار اس کی آنکھیں کھلی تھیں۔ محسوس لوگوں..... مختلف خیالات سے آگاہی ہوئی تھی۔ محمود بٹ کے بھی ایسے ہی تاثرات تھے۔ ایسے دوسرے کی حقیقت عیاں ہو جانے کی خفت نے دونوں کو ذرا کھنچا کھنچا سا کیا ہوا تھا مگر اب جب اپنے ہونے کی ”شرم“ نہ رہی تو کھنچاؤ بھی دور ہو گیا۔

دونوں ہی ایک بالکل مختلف پس منظر سے ہونے والی وجہ سے خود کو اسکول اور کالج کے ماحول میں ایڈجسٹ نہیں کر پائے تھے۔ امیر، مارڈرن اور ایجوکیڈ فیملیز سے تعلق رکھنے والے کلاس فیروز کے سامنے خود کو جگانے کے لیے دونوں خود پر ملمع چڑھاتے گئے۔ ان کی کم عمری اور کم فنیسی کے دور کا واقعہ تھا اور باہر ہونے کے بعد بھی وہ خود فریبی کی اس لت سے چھٹکارا نہ پاسکے تھے۔ شاید اس کی وجہ وہی ماحول تھا جہاں وہ مس فٹ تھے مگر فٹ ہونے کی کوشش میں ہلکان ہو رہے تھے اور آج اس لت سے ناگواری محسوس ہو رہی تھی تو اس کی وجہ یہ خالص اور بے لوث ماحول تھا جہاں کے لوگ انہیں دل سے اپنا جان رہے تھے۔ قدر کر رہے تھے اور انہیں شرمندگی ہو رہی تھی کہ ایسا تو کچھ بھی نہیں تھا ان میں جس کی وجہ سے وہ اتنے احترام کے مستحق سمجھے جا رہے تھے۔

”آؤ بھئی، روٹی ٹھنڈی ہو رہی ہے۔ بسم اللہ کرو۔“ پاباشم کی آواز پر وہ اپنے خیالات کے بھنور سے نکلا۔ دن کا ڈیڑھ بج رہا تھا۔ بارہ بجے کے قریب باصدق نے اپنے ڈیرے پر ٹھنڈے ٹھار تر بوز سے تواضع کی تھی مگر چیلپانی دھوپ نے جسم کا سارا پانی مساموں کے راستے باہر نکال کر پھر سے تھکان اور بھوک کو غالب کر دیا تھا۔ پیل کے چوڑے پتوں اور دور تک پھیلی ہوئی شاخ در شاخ جھت والے درختوں کی گھنی چھاؤں کے نیچے چار پائیاں بچھی تھیں۔ لسی سے بھرے مشکے، دہی کے کٹورے، مسالہ لگے کھیرے، بیسن کی تندوری روٹیاں، سوڑے کا اچار اور بیگن کا بھرتہ... دوپہر کے کھانے کے لوازمات تھے۔ خوب پیٹ بھر کے کھاتے ہوئے اسے یاد بھی نہیں رہا کہ چند گھنٹے قبل وہ ٹھونس ٹھنسا کر ناشتا کرنے پر خود کو سو

English  
UBTAN TURMERIC  
CREAM

only

صلواتیں سنا چکا تھا۔

\*\*\*

”ہا..... ہائے.... پائی جان، یہ کیا؟“

”کو مصلن نے اسے شیمپو کی بوتل، تولیا اور صابن اٹھائے، غسل خانے کی طرف جاتے دیکھا تو ایک ہاتھ کمر..... بلکہ کمر پر اور دوسرا ہاتھ بڑے اسٹائل سے اپنے پھاوڑا نمادانتوں پر رکھ کے حیرت سے پوچھا۔ یہاں سے وہاں تک ہاتھ پیر چھوڑ کر بیٹھی ناک پھولے ہوئے گالوں سے مزید جگہ کے حصول کے لیے نبرد آزما تھی۔

”یہ.... یہ شیمپو ہے۔ تم کیا اسے کڑھی سمجھ رہی ہو؟“

”ناں جی، اتنا تو مجھے پتا ہے کہ یہ سم پو ہے پر یہ آپ لگاؤ گے؟“

”مرد ہو جی۔ مرد ہونے کے سم پو اور صابون لگاؤ گے؟“

”کھی کھی کھی....“ یہ تو زانیوں کے استعمال کی چیزیں ہیں؟“ وہ چڑ گیا۔ پاس سے گنڈیریاں چوستی گزرتی ماسی خورشید کے کان کھڑتے ہو گئے۔

”ہائے میں مر جاواں.... یہ کیا باتیں ہو رہی ہیں۔ شرم دا گھٹا، کڑیوں کے ساتھ زنانہ استعمال کی چیزوں کی باتیں ہو رہی ہیں؟“

”آیا منڈا کیا بے شرمی دکھا رہا ہے۔“

”لا حول ولا.....“ وہ سٹپا کے کو مصلن کو دیکھنے لگا جو بے فکری سے سر کھجاتی جھاڑو پھیرنے لگی تھی۔

”واٹ مام..... کیوں بغیر وجہ کے CRY کرنے لگتی ہو۔ یہ کو ایڈیٹ شیمپو کے بارے میں کہہ رہی ہے کہ یہ صرف لیڈیز کے لیے ہوتا ہے، جیشس کے لیے نہیں۔“

”مشرقی عرف میری نے بروقت امدادی کمک پہنچائی۔ وہ چہرے پر کوئی ماسک لگائے ہوئے اندر سے نمودار ہوئی تھی۔

”دفع دور، یہ گاڑی جھاگ بھی کوئی سر صاف کرتی ہے؟“

”بندہ ہو چاہے زنانی، ایسی الٹی سیدھی چیزیں نہیں لگانی چاہئیں، جو بات کھٹی لسی سے سرد ہونے میں ہے وہ صابنوں میں کہاں.....“ انہوں نے صلاح دی پھر دختر نیک اختر کو دیکھ کر ہڑبڑا گئیں۔

”لغنتیے یہ چکر (کچنر) کیوں منہ پر تھوپ لیا ہے؟“

”مام یہ ماسک ہے..... ماسک.....“

”اور کتنا ماس چڑھائے گی؟ کھا کھا کر اور بیٹھ کر

کے نر ماس ہی تو چڑھتا جا رہا ہے تجھ پر۔“

”ایک بار پھر صاف گوئی کا مظاہرہ کیا گیا جس پر مشتری نے واک آؤٹ کا حربہ آزمایا۔

بے بے کی سخت وارننگ سے ڈر کر یا پھر یا نہیں چھترول اور گاؤں کے کتوں کے خوف سے وہ اپنی ٹیکسٹ کی کلیکشن تو ساتھ نہیں لایا تھا لیکن آج دو دن تک مسلسل شلواری قمیص میں ملبوس رہ رہ کر جب اسے اپنے آپ بے ڈول اور بے مہار سا محسوس ہونے لگا تو اس نے بیگ میں سب سے نیچے رکھا کاشن کا کلر فل ٹراؤزر اور ٹی شرٹ نکالی جو ہزار ریڑھیوں پر سے چھان پھنگ کے بعد منتخب کی گئی تھی۔

”نہا دھو کر جب وہ گھر کے فیروز کی ڈرننگ کے ٹراؤزر جس پر آٹھ تھی گلابی بڑے بڑے پھول بنے تھے اور گلابی اور سفید لائٹنگ والی شرٹ پہن کے تو اسے بال بال رکڑنا باہر نکلا تو سرخ آئینوں والے صحن کو جھاڑو اور پانی کے پائپ کی مدد سے دھوتی کو مصلن نے ایک فلک شکاف ققمہ لگایا۔

”باؤ، تسی تے بالکل بڈھی میم لگ رہے ہو۔“

”باؤ نے بڈھی میم سے گبرو جوان بننے میں فقط چند سیکنڈ لگائے۔ ذرا سی دیر میں وہ پھر سے لھے کے کڑکڑاتے کلف زدہ شلواری کرتے میں ملبوس تھا۔

”مس پروین، کیا ایک کپ چائے مل سکتی ہے؟“

اسے اتنا اندازہ تو ہو گیا تھا کہ بیٹنوں تو اس سے پردہ کر رہی ہے نہ ہی اس کا باقاعدہ پردہ کرایا جا رہا تھا۔ بلکہ اس کا کم کم حمید کے سامنے آنا صرف اس کی محتاط اور سنجیدہ طبیعت کی وجہ سے تھا اور کچھ اسکی مصروفیات بھی اسے الجھائے رکھتی تھیں۔ گرمیوں کی تعطیلات کی وجہ سے کالج تو بند تھا لیکن گھر میں تین مختلف جگہ سے آئے ہوئے مہمانوں کی وجہ سے گہرداری کا زور تھا۔ دوپہر کے بعد گاؤں کی لڑکیاں اپنی اپنی کتابیں اٹھائے اس سے پڑھنے آتیں۔ بعض لڑکیاں سلائی اور کڑھائی سیکھنے بھی آتی تھیں۔ جو وقت بچتا وہ اس کی اپنی پڑھائی کے لیے مختص تھا۔ اس وقت بھی جب لڑکیوں کے پڑھ کر جانے

جلد کارنگ روپ

CREAM

رنگت گوری

الذرا فیرس کریم

ACNE GEL

PAKFEZA Please register

”چائے ابھی بن جاتی ہے۔“

غالباً کہنے کا مقصد یہ تھا کہ اپنی راہ لے جائے۔

جائے گی..... لیکن وہ بھلا ایسے حسین نظارے کو تیرے

اندر ”ماسیوں کی میٹنگ“ میں کس لیے جاتا ہے۔

نے کٹوری پر چٹنی لٹائی اور بے ساختہ انگلی چومتے

ہوئے، زور سے آنکھیں میچ کے ایک کھٹ میٹھا سا چائے

لیا تو مسکراہٹ حمید کے لبوں پر کھٹے آموں کے کوارے

ذائقے کی طرح پھیل گئی۔

\*\*\*

”آج گاؤن ہے، جانا تو پڑے گا۔“ ماسی تاجاں نے

پُرسوج انداز میں سر ہلایا۔ وہ اور محمود ابھی ابھی

بھائی جان کے ساتھ اندر داخل ہوئے تھے جہاں ایک

گبیر مسئلہ زیر بحث تھا۔ بیٹو، چھینو، میری اور کو

سر نیہواڑے پیٹھی تھیں۔ ماسی خورشید شادو نائے

تائیں دیواری تھیں اور ساتھ ساتھ بڑے سر میں

ہائے ہائے بھی کی جا رہی تھی۔ بے بے اس سے ذرا

فاصلے پر بیٹھی، کپکے ہوئے جامن کھاتی، کینہ تو ز نظر

سے اپنی بہن کی خراٹ منڈ کی مکاری ملاحظہ فرما رہی

تھیں۔

”خیر تو ہے؟“ بھائی جان نے پوچھا۔

”ہاں، خیر ہی ہے۔“ گاؤن کا صدا (بلاوا) آ

ہے۔ ادھر خورشید کے گوڑے گئے (گھٹنے، نخنے) دررا

رہے ہیں۔ کڑیوں کے ساتھ کون جائے۔ تم بھی خیر۔

اپنے تاؤ کے ساتھ لاہور کی منڈی جا رہے ہو۔“

”تو کوئی بات نہیں، حمید ہے اور اس کا در

محمود۔ یہ ساتھ چلے جائیں گے بلکہ ذرا رونق میلہ

دیکھ لیں گے۔“ انہوں نے تجویز پیش کی جسے حمید نے

کر دیا۔

”لیکن بھائی جان میں اپنے ساتھ گاؤن وغیرہ

لایا۔ یہ دو چار شلوار سوٹ ہیں یا پھر ایک جینز۔ دیے

اتنی گرمی میں نائٹ گاؤن؟“

”اویا یہ گاؤن وہ والا نہیں۔“ وہ ہنسنے لگے۔

ناز اور مشتری بھی ہنسی چھپاتی ایک دوسرے پر

کے بعد بیٹو نے سب آموں پن مار لیا تو وہ پیچھے ہی

چلا آیا اور چائے کی فرمائش کی لیکن وہ سرکان لپیٹے ابلے

آلو کاٹنے میں مصروف رہی۔ اس نے پھر دہرایا۔

”مس پروین، میں آپ سے مخاطب ہوں۔“

”مگر میرا نام پروین نہیں۔“

”تو پھر.....؟ بیٹو میرا مطلب ہے کہ.... چلیں بیٹو

ہی سہی لیکن نک نیم بہر حال نک ہوتا ہے، اصل نام سے

پکارنے پر آپ کو اعتراض کیوں ہے؟“

”کوئی اعتراض نہیں مگر پروین میرا اصل نام نہیں۔

میرا نام پری ناز بانو ہے۔“ اس نے آلوؤں والا برتن

پرے سرکایا اور چوکی پر بیٹھے بیٹھے ہی رخ پھیر کے نیچے

لگے نلکے سے ہاتھ دھونے لگی۔

”پری ناز! پری ناز بانو! وہ حیرت سے دہرانے لگا۔“

”ملانی جی نے۔ باجی کے نام شہناز کی مناسبت سے

پری ناز رکھ دیا۔“ اب اس نے اسل پر امبی (کیری) کوٹنا شروع کر دی۔

”خیر.... پری ناز نام رکھنے کے لیے صرف اتنی سی

مناسبت کافی نہیں تھی..... اور بھی بہت سی وجوہات ہو

سکتی ہیں.....“ اس نے پھر سے تفصیلی جائزہ لیا۔

کالی سوتی شلوار میں سبک سے پیروں کی سفیدی

نمایاں ہو رہی تھی اور سیاہ دوپٹی کی چپل کوئل سی انگلیوں

کو اور بھی حسین بنا رہی تھی۔ مسالا کوٹنے والے

ڈنڈے پر سختی سے رکھے ہاتھوں کی سادگی غضب ڈھا رہی

تھی، انگلیوں کی پوریں سفید پڑ رہی تھیں اور ہتھیلیاں

گلابی ہو رہی تھیں۔ اس کے وجود کی آدمی سے زیادہ

خوبصورتی اس کے ہاتھ پیروں میں تھی۔ انگوری سبز اور

کالے پرنٹ کے قمیص دوپٹے میں اس کا پیش سے متمتا

چہرہ بے حد دلکش نظر آ رہا تھا، دوپٹے کی چھاؤں سے ڈھکی

پیشانی پر سینے کی ننھی ننھی بوندیں کھڑی مغرور ناک میں

چاندی کی کیل اور سختی سے بھینچے شگوفہ سے گلابی

سب..... وہ پورے انہماک سے چٹنی سینے میں مصروف

تھی۔ ڈنڈا ایک طرف رکھ کے اس نے چائے کا پانی

چڑھایا اور جانے والی نظروں سے اسے دیکھا۔

یہ آواز بلاشبہ مشتری کی ناک سے نکلی تھی۔ وہ بولنے کے لیے گلے کا اور گانے کے لیے ناک کا استعمال کیا کرتی تھی۔ مودا بڑا دل لگا کے سننے لگا۔ حمید نے مشکوک نظروں سے گھورا تو داد طلب لمحے میں کہنے لگا۔

”میری کی آواز حدیقہ کیانی سے کتنی ملتی ہے؟“

”اتنی ہی جتنی کہ عطا اللہ عیسیٰ خیلوی کی تانگیہ شکر سے۔“ سنجیدگی سے ملے جواب پر اس نے سرد ہنستا بند کر دیا۔

”بینو..... اب تیری باری ہے، چل چل نخرے نہ کر۔“

”اور کیا؟ بھلا کوئی ڈھولک تیری آواز کے بغیر جگ سکتی ہے؟“ ایک اور آواز آئی۔

”ہاں بینو باجی، وہ والا گائیں۔“ میری نے فرمائش کی۔

”کوئی شہری بابو، دل لہری بابو پگ باندھ گیا کھنگھرو.....“

میں چھم چھم نچدی پھراں.....“

ایک بار پھر ناک کو زحمت دی گئی۔

”رہن دے مشتری، تو اپنے سڑے بے گانے اپنے پاس رکھ۔“ کسی دل جلی نے ہاتھ جوڑے تھے۔ ”یہ کوئی شادی ویہا پر گانے والے گیت ہیں۔“

”ہاں بس، اب جب تک بینو گانا نہیں سنائے گی۔“

میں بھی ڈھولک نہیں بجاؤں گی۔“

اور حمید جنجوعہ کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اپنی جگہ سے اٹھ کر نیچے جھانکنا شروع کر دے۔ اگر آس پاس بیٹھے گاؤں کے دوسرے لڑکوں کا خیال نہ ہوتا تو شاید وہ بھی اوپر سے ایک فرمائشی نعرہ بلند کر دیتا۔

”گورے رنگ تے دوپٹیاں دی چھاں کر کے دل لے جا، نکلی جی ہاں کر کے.....“

دل لے جا، نکلی جی ہاں کر کے.....“

بہت سی فرمائشوں کے جواب میں پری ناز نے شرماتے جاتے، اس گیت کے چند بول گنگنائے۔ تمام تر جھجک کے باوجود آواز کا لوچ اور گداز دل میں اتر رہا تھا۔

”تو کہا مجھے بیجا، رسنگ نہں آتے؟ آتے ہں۔“

”ڈھولک کی رسم کو ”گاؤن“ کہتے ہیں۔ پٹواری صاحب کی بڑی بیٹی کی اگلے جمعے کو شادی ہے۔ آج سے ڈھولک رکھی جا رہی ہے۔“

”ہاں تو اچھا ہے یہ بھی پنڈی رسمیں دیکھ لیں۔ کیسے وہاہ ہوتے ہیں ادھر۔ جاؤ کڑیو..... تیار ہی پھڑو (پکڑو)۔ یہ دونوں ہیں ناں تمہارے دیر۔ ان کے ساتھ چلی جاؤ۔“

شادو ناٹن نے ٹانگیں دبانے کا شغل عارضی طور پر روکتے ہوئے دخل دیا اور محمود اور حمید سر سے پیر تک جھنجھلا اٹھے۔

”دیر؟“ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ محمود نے تسلی دی۔ ”ہاں دیر..... تم میری کے اور میں بینو کا دیر۔“

”دیس گڈے، وہ مطمئن ہو گیا اس درجہ بندی کی۔“

”خالہ آپ بھی ساتھ چلی چلیں۔“ محسن بھائی جان نے بے بے کو صلاح دی۔

”ناں پتر چار دن ہو گئے۔ جس کام سے آئی ہوں وہ کیا ہی نہیں۔ آج ذرا اپنی بہن سے کچھ صلاح مشورے کروں گی۔ حمید نے کن آنکھیوں سے پری ناز کی طرف دیکھا، وہ میری کے چنگی بھرنے پر لجا کے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

جناکڑ جیرے تے.....

کاسنی روپے والے.....

منزاعا شق تیرے تے.....

کوٹھے پر دوسرے لڑکوں کے ساتھ چٹائی پر بیٹھ کے گیس لگاتے وہ ساتھ ساتھ نیچے صحن سے آتے گیتوں سے بھی لطف اندوز ہو رہے تھے۔ اس گیت کے بولوں کی بار بار کی تکرار اور پھر لڑکیوں کے ہنسی ٹھٹھول پر وہ چونک اٹھا۔ اچانک اسے خیال آیا کہ پری ناز نے کاسنی لان کا پرنٹ بوٹ پہن رکھا تھا جس کے پلین کاسنی دوپٹے پر ہم رنگ نکل گئی ہوئی تھی۔ یقیناً ان بولوں کے ذریعے اسے بھی بڑا جا رہا ہو گا۔ وہ زیر لب مسکرائے لگا۔

”بڑھتی جوانی..... میری حال مستانی“

... لیا کہنے کا مقصد یہ تھا کہ اپنی راہ لہو..... لیکن وہ بھلا ایسے حسین نظارے بیویوں کی میٹنگ“ میں کس لیے جاؤ..... ی پر چینی الثانی اور بے سائزہ..... سے آنکھیں میچ کے ایک کھٹ..... ہٹ حمید کے لبوں پر کھٹے آموں کے..... رح پھیل گئی۔

گاؤن ہے، جانا تو پڑے گا۔“ ماسی نے..... میں سر ہلایا۔ وہ اور محمود ابھی..... کے ساتھ اندر داخل ہوئے تھے جہاں..... بحث تھا۔ بینو، چھینو، میری اور کو..... پیٹھی تھیں۔ ماسی خورشید شادو ناٹن..... تھیں اور ساتھ ساتھ بڑے سڑے..... کی جا رہی تھی۔ بے بے اس سے..... پکے ہوئے جامن کھاتی، کینہ تو..... خراٹ نند کی مکاری ملاحظہ فرما.....

”بھائی جان نے پوچھا۔“

”یہ ہے۔“ ”گاؤن“ کا صدا (بلانا)..... کے گوڑے گئے (گھٹنے، ٹخنے)..... کے ساتھ کون جائے۔ تم بھی..... لاہور کی منڈی جا رہے ہو۔“

ت نہیں، حمید ہے اور اس کا..... لے جائیں گے بلکہ ذرا رونق ملی..... یوں نے تجویز پیش کی جسے حمید.....

مان میں اپنے ساتھ گاؤن وغیرہ..... سوٹ ہیں یا پھر ایک جینز۔ دیے.....

گاؤن؟“

نا وہ والا نہیں۔“ وہ ہنسنے لگے۔ پ..... ہنسی چھپاتی ایک دوسرے پر گر.....

مشتری نے اس کو ملنے والی تعریفوں سے متاثر ہو کر اعلان کیا۔ ”آفر آل یہ ہمارا کلچر ہے۔“

”سب توں سوہنیا.....“

پاں پاں.....

ہائے وے من موہنیا.....

ٹوں ٹوں....

میں تیری ہو گئی..... پاں پاں

پیاروچ کھو گئی.....“

میوزک کے ردھم کے ساتھ اس نے نور جہاں کی روح کو تڑپایا تو حمید اس کے زرخیز ذہن کی داد دیے بغیر نہ رہ سکا۔ جس نے گیت کے بولوں کے ساتھ ساتھ پورا آرکسٹرا پاں پاں اور ٹوں ٹوں کے صوتی تاثرات کے ساتھ واضح کر دیا تھا۔ مودے پر نظر پڑی تو وہ بری طرح شرمزادہ ہوا۔

”یہ تو کیوں امراد جان ادا والی ادا میں دکھا رہا ہے۔“

”تم نے سنا نہیں مجھے ”سب توں سوہنیا“ کہہ رہی ہے۔“

”خوش فہمی ہے، وہ تمہیں پاں پاں اور ٹوں ٹوں کہہ رہی ہے۔“



”میدے پائی جان، آپ کو ماسی جی بلا رہی ہیں۔“  
لالو نے نیچے سے حلق پھاڑ کر آواز دی۔

رات کو دیر تک رسم میں شریک رہنے کی وجہ سے صبح دن چڑھے اس کی آنکھ کھلی۔ کل رات وہ لوگ برآمدے کے بجائے چھت پر سوئے تھے اور اب تیزی سے پھیلتی دھوپ بھی اسے بستر سے اٹھانے میں کامیاب نہیں ہو پا رہی تھی۔ آنکھ کھولتے ہی کروٹ بدلنے پر اسے نیچے آنگن کا منظر دکھائی دیا۔ پری ناز حسب معمول مٹی کے کٹورے میں موتیے کی کلیاں چن رہی تھی۔ اس نے رات والا کاسنی سوٹ اب تک پہن رکھا تھا۔

”لالو، ذرا دیکھ..... اوپر جا کے..... مہمان اٹھے ہیں تو ناشتا بناؤں۔“ اس نے بھائی سے کہا تو حمید کو شرارت سوچھی۔ چھت کی منڈیر بس ذرا سی اونچی تھی۔ نیچے سے

اوپر کا اور اوپر سے نیچے کا منظر صاف دکھائی بھی دے سکتا تھا اور سنائی بھی۔ اس نے دھیمے سروں میں گنگناٹا شروع کیا۔

”اک پھل موتیے دامار کے جگا سوہنیے.....“

اک پھل موتیے دا.....

مار کے جگا سوہنیے.....“

اس نے چونک کر اوپر دیکھا۔ بے ساختہ ابھرتی

مسکراہٹ پر بڑی مشاقتی سے قابو پایا اور وہاں سے نائب

ہونے میں پل کی دیر نہ لگائی۔ ایک ٹانے کو ملی نظرس اور

لحظہ بھر کے لیے کھلی اس مسکراہٹ نے حمید کی کسمندی

میں ایک نشہ آمیز سا سرور شامل کر دیا اور یہ غنودگی

بھک سے اڑ گئی جب لالو نے اسے بے بے کا بلاوا دیا۔

ناچار اسے بستر کی جان چھوڑنا پڑی۔

جیسے ہی اس نے پرائے کا آخری لقمہ نگا۔ بے

نے بغیر کسی تمہید کے اصل بات کہہ دی۔

”میدے، میں نے فیصلہ کیا ہے کہ اس معاملے میں

اور زبردستی ٹھیک نہیں۔ اگر تو پنڈ میں ویاہ نہیں کرنا چاہتا

تو ٹھیک ہے..... تیری مان لیتی ہوں، خواہ مخواہ زبردستی

کے تیری بھی ناراضی مول لوں اور اس نمائی کی زندگی

برباد کروں۔ ٹھیک ہے پتر..... جیسی تیری خوشی، میر

تاجاں کو سمجھا دوں گی۔ دکھ تو ہو گا بے چاری کو..... لیکن

بات سمجھ جائے گی۔“

”بے بے..... بے..... بے بے.....“ وہ ہلکا کے

گیا۔

”اور کی؟ تو سمجھتا ہے میں تیری خوشی نہیں چاہتی

جیسے میرا چین پتر راضی..... اس میں، میں بھی خوش۔“

”لیکن بے بے..... وہ پینو..... ماسی..... پینو

اصل میں پینو بری لڑکی نہیں... دراصل میں اسے.....

”ہاں ہاں پتر، پتا ہے مجھے۔ پینو تو واقعی بہت ہے

گڑی ہے بس تیرے لائق نہیں۔ کہاں وہ پنڈ کی سید

سادی، چپ چسپتی لڑکی، کہاں تو شہر کے کالج کا پڑھ

فیشن منڈا۔ تیرے ساتھ تو اچی ہیل پہننے والی، کئے بالا

والی، گٹ پٹ کرنے والی ہی ہے گی۔“

”بے بے، لیکن مجھے یہیں.....“ اس نے کہنے

پوسٹ بکسر



ماننا مجھ پر فرض ہے۔ تیری خواہش میں پوری نہیں کروں گا تو اور کون کرے گا۔

”ہیں..... ہیں..... کیا کہا؟“ بے بے ہوش ہوتے ہوتے نیچی۔ اسی وقت پری ناز اس کے لیے چائے لے کر آئی۔ وہ چپ کر گیا۔

”بول نہ پتر، گنتی اچھی اچھی باتیں کر رہا تھا تو اور وہ بھی پہلی بار۔“ پری ناز اس کے آگے کپ رکھ کر ناشتے کے برتن ٹرے میں رکھنے لگی۔

”میں یہ کہہ رہا تھا بے تو فکر نہ کر، تیرے دل کے ارمان ضرور پورے ہوں گے۔“

”ایک بات کہوں، آپ برا تو نہیں منائیں گے؟“ پری ناز برتن اٹھا کے واپس لے جاتے ہوئے اچانک

رک کر پوچھنے لگی۔ اس کے نفی میں سر تلا نے چراس نے کہا۔

”آپ خالہ جان کے ساتھ تو تکار کے ساتھ کیوں بات کرتے ہیں۔ آپ کا ان کے ساتھ ایسا رشتہ تو نہیں۔“

یہ بے تکلفی نہیں بد تمیزی اور بد تمیزی ہے۔ کوئی جاہل گنوار شخص ایسا کرے تو بات ہضم بھی ہوتی ہے لیکن

آپ تعلیم یافتہ ہیں، سمجھ دار ہیں۔ آپ کو ایسا روٹیہ سوٹ نہیں کرتا۔“ وہ اپنی بات کہہ کر چلتی بنی اور حمید کو ایک

نئی سوچ میں ڈال گئی۔

”یہ تو مجھے خیال ہی نہیں آیا کہ میں اسے کیسا لگتا ہوں۔ وہ میرے دل کو بھاگتی ہے تو اس کی کوئی وجہ ہے

بلکہ ایک نہیں کئی وجوہات ہیں لیکن مجھے قبول کرنے کی اس کے پاس کیا وجہ ہو سکتی ہے؟ کیا ہوں میں؟ ایک

سطھی سا، پھچھورا، بناوٹی، جھوٹا اور نکما انسان..... لیکن اب تو میں اپنی خامیوں سے چھٹکارا پانے کی کوشش کر رہا

ہوں۔ وہ بناوٹ، وہ طمع، وہ جھوٹ کب کا چھوڑ دیا اور نکتے پن سے بھی توبہ کر لی ہے۔ واپس جاتے ہی ابا کے

دوست جو ہدیری یار محمد کی فیکٹری کی جاب والی آفر قبول کر لوں گا۔ ٹھیک ہے..... سب ٹھیک ہے..... لیکن اسے

کیا پتا.... وہ اگر مجھے ناپسند کرتی ہے تو میں کس منہ سے.... بے بے کو... اس نے سوچتے سوچتے کپ اٹھا کر لب سے لگا لیا۔ اس کی نگاہیں اب تک سامنے کے دروازے کی

جانب تھیں۔ جہاں سے وہ اندر آئی تھی اور اس کے دل میں ایک نیا وسوسہ ڈال کے واپس چلی گئی تھی۔

”تو کچھ کہہ رہا تھا پتر؟“

”ہاں..... جی بے بے، میں آپ سے یہ کہہ رہا تھا کہ آپ.....“

”یہ تو مجھے آپ آپ کہہ رہا ہے..... اور وہ بھی اس لڑکی کے کہنے پر؟“ بے بے نے حیرت سے پوچھا۔

”جی بے بے، آپ کے کہنے پر بھی کہہ سکتا تھا مگر سکتی تھیں مگر وقت نے سکھا دیں..... چلو..... دیر سے ہی

سہی، سیکھ تو لیں۔“ ایک افسردہ سا سانس بھر کر اس نے کپ واپس پرچ میں رکھنا چاہا تو چونک گیا۔ پرچ میں عین

اس جگہ، جہاں سے اس نے کپ اٹھایا تھا موتیے کی ایک ادھ کھلی کلی پڑی تھی۔

”اک پھل موتیے دانار کے جگا سوہتیے.....“

”اور تم نے مجھے سچ سچ جگا دیا ہے پری ناز..... اگر آج، ابھی اسی وقت تم میرے حواسوں پر یہ موتیے کی کلی

نہ مارتیں تو میں خواہ مخواہ کے بے نام انڈیشوں میں گھر کے یہ موقع گنوارتا۔“

اس نے پری ناز کے اس خوبصورت اقرار کو اس ”نکی جی ہاں“ کو اپنی مٹی میں بھر لیا۔

”اور بے بے، اب بھی وقت ہے۔ اگر آپ مجھے کچھ نہیں سکھا سکتیں تو پھر کسی سکھانے والی کا بند دست

کردیں۔“

”ہیں؟ استانی رکھ دوں؟ اس عمر میں....؟“

”ہاں، پینو استانی، میرا خیال ہے کہ مجھے ”مت دینے“ کے لیے اس سے بہتر کوئی اور نہیں۔ کیا ارادہ ہے

پھر؟ اس نے مسکراتے ہوئے بے بے کے حیرت زدہ چہرے کی طرف دیکھا، جہاں اس کی مسکراہٹ دھیرے دھیرے حیرت کو یقین میں بدل رہی تھی۔

کبھی تو ایسا بھی مری طرف تم وہ جس غرور اور کبھی اسی تمکننت